محافلِ و مجالس

حصّہ اوّل

مصنف

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

مذہبی دُنیا
۱۹۵ بخشی بازار الہ آباد فون: ۶۰۶۶۳۶

باسمہ سبحانہ

محافل و مجالس

حصہ اول

تصنیف

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

ناشر

محمد انعام نقوی

مذہبی دنیا ۱۹۵ بخشی بازار الہ آباد

نام کتاب	محافل و مجالس حصہ اول
تصنیف	علامہ السید ذیشان حیدر جوادی
کتابت	سید محسن اختر

MAZHABI DUNIYA
195- BUXI BAZAR
ALLAHABAD-211 003, PHONE : 606636

ملنے کا پتہ

رحمت اللہ بک ایجنسی
کاغذی بازار میٹھادر
کراچی ۷۴۰۰۰
PH : (021) 32431577 Mob: 0341-7234330
Mob : 0314 - 2056416 - 0332 - 3870828

باسمہ سبحانہ

حضور سرور کائنات سے
امام زین العابدینؑ تک

چھ معصومینؑ کی داستان عظمت و عزیمت

تصنیف

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

اداریہ

خدا کا شکر ہے کہ جناب علامہ کی اس مایۂ ناز تصنیف کا پہلا ایڈیشن اپنی ندرت، افادیت اور مقبولیت کی بناء پر ایک ہی سال کے اندر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور اب ہم اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

جناب علامہ کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ انھوں نے بہ تقاضائے وقت جتنی مجلسوں کی کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں اپنے بیان کو صرف فضائل و مصائب کے رسمی انداز تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ حضرات معصومینؑ کے واقعاتِ زندگی ان کے بلند کردار کی روشنی میں ایک ایسا نظام مرتب کر دیا ہے جس سے ملت اسلامیہ برابر مستفید ہوتی رہے، اس میں دینی شعور بیدار رہے اور اس کی تہذیب و اخلاق میں جلا پیدا ہوتی رہے۔ آج کل ہمیں ایسے ہی کردار ساز تصانیف کی ضرورت ہے، اور جناب علامہ نے حتی الامکان اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

والسلام

باعث سجاد

دنیا کی ہر شے تغیر پذیر ہے اور کوئی شے انقلابات کی گرفت سے آزاد نہیں ہے، چنانچہ ذاکری کے میدان میں بھی جس قدر تغیرات اور انقلابات رونما ہوئے ہیں وہ اہل بصیرت کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں.

خدا کا شکر ہے کہ ایک دَور وہ بھی آیا جب قوم میں داد و تحسین سے ہٹ کر ذہنی صلوات فراہم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور ضرورت وقت نے ہر شخص کو اپنے انداز بیان کی تبدیلی پر آمادہ کیا یہ تبدیلی کس حد تک ہوئی؟ اور اس کی پشت پر کون سے انقلابی عوامل کارفرما تھے؟ یہ بات ذہن کو الجھا دینے والی اور فسادات کو ہوا دینے والی ہے. اس پر گفتگو کرنا مقصد کی پامالی کے مترادف ہے. اس لئے اس سے قطع نظر کر کے صرف اس مسئلہ پر نگاہ رکھنا ہے کہ بدلتے ہوئے عصری تقاضوں نے جدید قسم کی مجالس و محافل کے مسودات کا مطالبہ کیا. اور کھلی ہوئی بات ہے کہ باکمال ذاکرین ہر میدان میں اپنے علم و فن کا مظاہرہ کر لیتے ہیں لیکن ابتدائی اور متوسط درجہ کے ذاکرین کے لئے یہ انقلابات ایک پیغام یاس اور احساس حرماں لے کر آتے ہیں.

ذاکری کے مسودات کی کتابیں بازاروں میں بھری پڑی ہیں اور آئے دن مختلف انداز کے مسودات شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس رخ پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی.

آج سے چند سال قبل جب اپنی "ایمانی بصیرت" کی بنا پر میں نے آنیوالے انقلاب کی آہٹ محسوس کی تھی تو قلم کو اس میدان کی طرف موڑ دیا تھا. میرے دو مسودے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے اور ان کے مقدمہ میں اس تازہ ترین کتاب کی طرف

اشارہ تھا لیکن درمیان میں حالات نے پھر ذہن کے رُخ کو موڑ دیا اور یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کتاب سوانح حیات کی تالیف سے علمی شخصیت بنتی ہے اور ذاکرین کے مسودات کی کتاب سے شخصیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا شمار تالیفات و تصنیفات میں ہوتا ہے۔

قریب تھا کہ قدموں میں لغزش پیدا ہو جائے اور بشری تقاضے نفس پر غالب آ جائیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ بعض غیبی عوامل نے سہارا دیا اور سوانح حیات معصومینؑ کو بہ شکل مجالس و مصائب مرتب کرنے ہی کو سرمایۂ سعادت سمجھا گیا تاکہ انھیں ایک شخص پڑھے تو سیکڑوں انسانوں تک خود بخود آواز پہنچ جائے۔

ہندوستان میں کتاب کی تالیف کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا اہم مسئلہ اس کی طباعت اور اشاعت کا ہے۔ یہ مسائل کچھ کم قیامت خیز نہیں ہوتے ہیں — خون جگر پانی ہو جاتا ہے اور کام مکمل نہیں ہوتا۔ سرمایہ کا مسئلہ اپنی جگہ پر ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ پہلے ایڈیشن میں میرے قدیم محترم مخلص ملا نانجی مرحوم (افریقہ) کے فرزندوں نے اس امر کی طرف توجہ کی تھی اور اپنے والد مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے اتنی رقم عنایت کر دی تھی کہ کتاب کی اشاعت کو سہارا مل گیا تھا اور اب دوسرا ایڈیشن "مذہبی دنیا" سیتاپور سے منظر عام پر آ رہا ہے۔ "مذہبی دنیا" الہ آباد کا نہایت درجہ فعال اور دیانتدار ادارہ ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنا یقیناً باعث اجر و ثواب ہے۔ رب کریم سے دعا ہے کہ خدا سب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور کتاب کو افادۂ عام کا سبب قرار دے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے اور قریب ختم ہے۔ مومنین کرام دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنے سے پہلے کتاب فراہم کر لیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

السید ذیشان حیدر جوادی

فہرست

بارِ سبحانہٗ

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

اسم مبارک	:	احمدؐ، محمدؐ،
لقب	:	مصطفےٰ، بشیر، نذیر، وغیرہ،
کنیت	:	ابوالقاسم،
والد ماجد	:	جناب عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم،
والدہ ماجدہ	:	جناب آمنہ بنت وہب بن عبدمناف،
ولادت	:	۱۷ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل جمعہ شعب ابی طالب،
بادشاہ وقت	:	نوشیرواں عادل،
ازواج	:	تیرہ (۱۳) جناب خدیجہ، جناب ام سلمہ وغیرہ،
اولاد	:	جناب سیدہ، قاسم، طیب، طاہر، ابراہیم،
شہادت	:	۲۸ صفر ۱۱ھ بروز دوشنبہ، مدینہ منورہ،
عمر شریف	:	۶۳ سال،

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم	بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلی محفل داستانِ عظمت سرکارِ دو عالمؐ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَفْضَلِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ

خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ

وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِہِمْ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

مالک کائنات عالم انسانیت کو اپنے کرم اور اپنی حکمت کاملہ سے آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے کہ ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ تمہارا کوئی فرض نہیں ہے اور تم پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ یہ اعلان درحقیقت دو قسم کے نظریات کی تردید ہے جو خالقِ کائنات سے ربط رکھنے والوں نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھے ہیں اور جن کی بنا پر گمراہی کا ایک اصول عالم وجود میں آ گیا ہے۔

خالقِ کائنات کے مسئلہ پر غور کرنے والے دو طرح کے ہیں۔

بعض افراد وہ ہیں جنھوں نے خالقِ کائنات کو اپنے مسائلِ حیات سے بالکل اجنبی اور بیگانہ بنا دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ اسے ہمارے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کا کام خلق کرنا تھا، اس نے کر دیا۔ اب ہمارے خیر و شر کیا ہیں اور ہمارے فائدہ و نقصان کے مسائل کیا ہیں؟ اسے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، انھیں ہم خود بہتر جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں صاحبِ شعور و ادراک بنایا ہے۔ ہم صاحبانِ عقل و فہم ہیں، ہمارے پاس فکر و نظر کی قوتیں ہیں، ہمارے پاس قلب و دماغ کا سرمایہ ہے۔ ہمیں کسی کی ہدایت

کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں کوئی قانون درکار نہیں ہے، نہ کسی ضابطۂ زندگی کی ضرورت ہے: ہم بے نیاز ہیں اور بے نیاز رہیں گے۔

ان بے چاروں کو اتنا بھی شعور نہیں ہے کہ اگر اس باشعور ہستی نے یہ شعور نہ دیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس خالقِ عقل نے یہ جوہرِ عقل نہ مرحمت فرمایا ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ جو کچھ ہے سب اسی کے کرم کا نتیجہ ہے اور جو سرمایہ ہے سب اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ انسان نے عقل و شعور کا مصرف بغاوت کو قرار دیا ہے، اور اس کے ذہن میں شعور و ادراک کا کل فائدہ یہ ہے کہ پیدا کرنے والے کا انکار کر دیا جائے اور اس کی ہستی کو غیر ضروری، بے فیض اور بے فائدہ قرار دے دیا جائے۔ اسے کچھ بھی عظمتِ خالق کا اندازہ ہوتا تو اس کے خیالات یہ نہ ہوتے اور اس کا طریقۂ فکر و نظر ایسا نہ ہوتا، اسے کم از کم یہ شعور تو ہوتا کہ جس نے پیدا کر کے نعمتِ زندگی دی ہے، جس نے عدم کو وجود کا لباس پہنایا ہے، وہ ہمارے حال پر مہربان ہے اور ہمارے مسائل کو ہم سے زیادہ جاننے والا ہے۔ لیکن نفس پرست انسان نے خواہشات کو خدا بنا کر واقعی خدا کے وجود سے انکار کر دیا اور اسی کو سرمایۂ فکر و نظر سمجھنے لگا۔

یہ بات صرف دنیائے کفر و الحاد تک محدود ہوتی تو کسی حد تک صبر آجاتا اور یہ کہنے کا موقع ہوتا کہ جن افراد نے ہستیِ معبود ہی کو نہیں پہچانا، ان سے اس سے زیادہ کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن قیامت یہ ہے کہ تاریخ کے ایک موڑ پر یہی خیال مسلمانوں کے ذہن میں بھی پیدا ہو گیا تھا اور یہی انداز منکرِ اعجازِ قرآن نے بھی پیدا کر لیا تھا ——— آپ یہ تعجب نہ کریں

کی اسلام میں ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور وحدہٗ لا شریک کا کلمہ پڑھنے والی اُمت اس انداز فکر کو کیوں کر اپنا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ایک لمحہ کے لئے حیات مرسلِ اعظمؐ کے بعد کے حالات کا جائزہ لیں تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مسائل میں اپنے کو خود مختار اور زیادہ عارف و عاقل نہ سمجھ لیا ہوتا اور رب العالمین کو حیات و کائنات کے مسائل سے بیگانہ نہ کر دیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خدا اور رسولؐ کے مقرر کئے ہوئے نمائندہ کے ہوتے ہوئے کوئی نیا انتخاب عمل میں آتا اور کسی نئے ذمہ دار امت کی ضرورت محسوس ہوتی۔ یہ انتخاب خود بتا رہا ہے کہ اُمت کو خدا پر اعتماد نہیں ہے اور وہ اپنے وجود کو خدا اور رسولؐ سے زیادہ اپنے مسائل کا ذمہ دار سمجھتی ہے اور یہ ایک ایسا نقطۂ امتیاز تھا جس سے اُمت کے دو حصے ہو گئے۔ خدا اور رسولؐ پر اعتماد کرنے والوں نے اس کے نمائندہ کا اختیار کیا اور اپنے نفس کے پرستاروں نے اس نمائندہ کو آگے بڑھایا جسے انھوں نے خود منتخب کیا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ امت اسلامیہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ اپنے نفس کا پرستار ہو گیا اور ایک نفس اللہ کا طرفدار ہو گیا۔

ایسے افراد ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے رب العالمین کو اپنے مسائل سے برطرف کر دیا ہے اور اپنے مسائل کے خود ذمہ دار بنے رہے ہیں۔ اور ایسے افراد بھی ہوتے رہے ہیں جنھوں نے کمال ایمان و عقیدہ کا اظہار کرتے ہوئے جملہ ذمہ داریاں اسی کے سر رکھ دی ہیں اور بظاہر ان کا خیال ہے کہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اسی کا فرض ہے کہ ہمیں راہ راست پر لگائے اور یہ اسی کی ذمہ داری ہے کہ ہمیں جنت تک پہنچائے۔ ہمارے پاس نہ کوئی اختیار ہے نہ ہماری کوئی ذمہ داری۔

یہ وہ گمراہ کن عقیدہ ہے جس کے پرستار بڑے خلوص سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب بغیر حکم خدا کے پتہ بھی نہیں ہل سکتا تو بندہ کیسے جنبش کر سکتا ہے۔ بندہ کے جملہ افعال کی ذمہ داری پروردگار پر ہے۔ ان افراد نے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ علم خدا کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا۔ اس میں حکم کا کوئی دخل نہیں ہے اور علم اور ہے اور حکم اور، علم کا قیاس حکم پر نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پتوں کے سلسلے میں تو لفظ حکم کا استعمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس شعور و ادراک اور قدرت و اختیار نہیں ہے لیکن انسان کے بارے میں اس لفظ کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ وہ صاحب شعور و ادراک ہے اور اس کے پاس جوہر عقل و فہم ہے۔ وہ پتوں کو ہوا میں اڑانے والا ہے خود پتہ نہیں ہے۔ وہ پتوں کو توڑنے والا ہے اور واضح لفظوں میں ہوا کا رخ بدلنے والا ہے، ہوا کے رخ پر اڑنے والا نہیں ہے۔ صلوات ـــ

مقصد کلام یہ ہے کہ دنیا میں دو طرح کے انسان پیدا ہوتے رہے ہیں اور مالک کائنات نے اس آیت میں دونوں کے نظریات کی تردید کی ہے جو افراد اسے اپنے مسائل حیات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں انھیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہدایت اور رہنمائی کی ذمہ داری اسی کی ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار اسی کے ہاتھوں میں ہے اور جو لوگ اسے تمام تر ذمہ دار بنا دینا چاہتے ہیں اور اپنے کو ہر منزل پر سبکدوش کر لینا چاہتے ہیں انھیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس پر صرف ہدایت کی ذمہ داری ہے انگلی پکڑ کر منزل تک پہنچانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ ہم نے صحیح راستہ کی ہدایت کر دی۔ اب چاہے انسان شکریہ ادا کرے یا کافر و منکر ہو جائے۔ تو اب کہنا پڑے گا کہ اسلام کی صحیح تعلیم یہی ہے کہ خدا کو اپنے

مسائل سے الگ بھی تر رکھا جائے اور اسے تمام تر ذمہ دار بھی نہ بنا دیا جائے اور یہی وہ درمیانی راستہ ہے جسے اہل بیت اطہارؑ نے اختیار فرمایا ہے اور جسے جبر و اختیار کی بحث میں جادۂ اعتدال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ جن لوگوں کے عقائد میں عدالت داخل نہیں ہے وہ کبھی منزل سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کبھی پیچھے رہ جاتے ہیں اور جن کے عقائد میں عدالت ایک بنیادی نقطہ ہے وہ درمیانی راستہ پر رہتے ہیں، نہ کبھی آگے بڑھتے ہیں نہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور ہم نے تو یہ منظر میدانِ غدیر میں صاف صاف دیکھا ہے کہ نقطۂ اعتدال کو سمجھانے والے پیغمبر نے آگے بڑھ جانے والوں کو پیچھے بلایا اور پیچھے رہ جانے والوں کا انتظار کیا کہ سب اکٹھا ہو جائیں تو علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا جائے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ اسلام کا نقطۂ اعتدال یہی ہے اور اس سے آگے بڑھ جانے والا بھی ظالم ہے اور اس سے پیچھے رہ جانے والا بھی صراطِ مستقیم سے منحرف ہے۔ "لا ینال عہدی الظالمین"۔ یاد رکھو ہمارا عہدہ ظالمین کو نہیں مل سکتا۔ صلوات۔

یاد رکھئے! شریعت کی ہدایت کی ذمہ داری پروردگار پر ہے اور عالم انسانیت کو راہ دکھانے کا فرض اس نے اپنے ذمہ لیا ہے اور اسی فریضہ کی ادائیگی تھی جس نے تخلیق کائنات میں اس ترتیب کو پیش نظر رکھا کہ راہ راست پر چلنے والے بعد میں پیدا ہوں اور راہنما پہلے پیدا ہو جائے تا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ راستہ پوچھنے والے موجود تھے اور راستہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ منزل تک جانے والے موجود تھے اور منزل تک لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ حکمت الہی اور کریم پروردگار کا تقاضہ تھا کہ اس نے عدم کے سناٹے کو "راہنما" سے توڑا۔ "راہ پیما" سے نہیں۔ کائنات کا وجود اول "راہبر" کو بنایا "راہرو" کو نہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں

یوں کہا جائے کہ اس نے اپنے قانون کے مزاج کو سمجھا دیا کہ آغاز کائنات میں جب کچھ نہ تھا تو صرف "راہنما" تھا۔ اور انجام دنیا میں بھی جب ساری دنیا فنا ہو جائے گی تو "راہنما" کا وجود رہے گا اب جسے الٰہی راہنما کو پہچاننا ہو وہ یہ شمع ہدایت لیکر آگے بڑھے اور یہ دیکھے کہ جہاں فنا کا سلسلہ قائم ہو جائے وہ خدائی سلسلہ نہیں ہے اور جہاں "یَبْقیٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ" کی شان سے راہنما وجہ اللہ بن کر باقی ہے وہاں الٰہی نمائندگی ہے اور اسی کو خدا کی نیابت و جانشینی کا حق ہے۔ صلوات ،

مالکِ کائنات نے اپنے اس فریضۂ ہدایت کو ہر دور میں ادا کیا اور ہر موڑ پر ایک نہ ایک راہنما کا انتظام کیا۔ تاریخ کے مختصر سے وقفہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کی آمد اس بات کی دلیل ہے کہ مالکِ کائنات نے کوئی دور، کوئی زمانہ، کوئی علاقہ، کوئی خطہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں اپنی طرف سے راہنما کا انتظام نہ کیا ہو اور جس میں اپنی ہدایت نہ قرار دی ہو۔ یہ بدنصیبی جیسے صرف امتِ پیغمبرؐ کے حصہ میں آئی ہے کہ ہر قوم و ملت پر رحم کرنے والے خدا کو اس کے حالِ زار پر رحم نہ آیا اور اس نے اس قوم کو حضورؐ کے بعد لاوارث چھوڑ دیا۔ العیاذ باللہ ،

عزیزانِ محترم! کرمِ الٰہی پر کتنا بڑا اتہام ہے یہ سوچنا کہ خدا نے امتِ پیغمبرؐ کو لاوارث چھوڑ دیا ہے اور اسے نہ ملت سے کوئی محبت ہے نہ مذہب سے کوئی تعلق۔ وہ نہ اسلام کی بقا چاہتا ہے نہ قرآن کی زندگی۔ غنیمت ہے اب بھی مسلمان اپنے خیالات کی اصلاح کر لیں اور سرکارِ دو عالمؐ کی ولادت باسعادت کے مبارک موقع پر یہ عہد کریں کہ اب کسی ایسے عقیدہ و خیال کو اختیار نہ کریں گے جو روحِ مذہب کے منافی اور نظامِ اسلام کو درہم برہم کر دینے والا ہو۔

یاد رکھئے! الٰہی ہدایتوں کا یہ سلسلہ جناب آدمؑ سے چلتے چلتے جناب ابراہیمؑ تک

پہنچا۔ انھیں مالکِ کائنات نے رسول بھی بنایا نبی بھی۔ قائد بھی بنایا امام بھی۔ خلت کا شرف بھی بخشا اور بیت فشکنی کا اعزاز بھی۔ انھیں معمارِ کعبہ بھی بنایا اور معمارِ امت بھی اور سب سے بڑا شرف یہ عنایت فرمایا کہ انھیں ایک پورے سلسلۂ ہدایت کا مرکز و مصدر بنا دیا اور دونوں بیٹوں کو نبوت و رسالت کے عہدوں سے سرفراز فرما کر ان کے اعزاز کو لاجواب بنا دیا۔

دنیا جانتی ہے کہ جناب ابراہیم کے دو فرزند تھے۔ ایک جناب اسمٰعیلؑ اور ایک جناب اسحٰقؑ۔ جناب اسمٰعیلؑ کی اولاد میں حضور سرورِ کائناتؐ ہیں اور جناب اسحٰق کی نسل میں سارے انبیاءِ بنی اسرائیل۔ جناب اسمٰعیلؑ نے راہِ خدا میں قربانی دی اور جناب اسحاقؑ نے امت کی نمائندگی کی لیکن ایک مسئلہ اس وقت پیدا ہو گیا جب قربانیٔ اسمٰعیلؑ بے اثر دکھائی دینے لگی اور نسلِ اسحاقؑ میں انبیاء کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دنیا انگشت بدنداں تھی کہ جس نے راہِ خدا میں زندگی قربان کی، جس نے ایک خواب کی بنیاد پر گلے پر چھری کا چلنا گوارا کر لیا، جو نوجوانی کے عالم منزلِ ذبح میں لیٹ گیا اور آخری سانس تک جادۂ تسلیم و رضا سے نہیں ہٹا۔ جس کی قربانی کو خدا نے منسوخ کیا مگر خود اس کے پائے ثبات میں جنبش نہیں آئی۔ اس کی نسل میں جو بھی آتا ہے وہ غیر نبی آتا ہے جو بھی پیدا ہوتا ہے وہ غیر رسول ہوتا ہے۔ نہ کوئی کتاب آتی ہے نہ کوئی شریعت۔ نہ کوئی نبی آتا ہے نہ کوئی رسول۔ تو کیا یہ قربانیٔ اسمٰعیل بالکل بے قیمت ہے۔ کیا اس کی بارگاہ میں ایثار و وفا کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ کیا اس نے قربانیٔ اسماعیلؑ کو رد کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم بھی اسے بے قیمت سمجھیں اور اپنے ذہن سے قربانی کی عظمت کو نکال دیں!

اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیا وجہ کہ جسے شرف قربانی نہیں ملا اس کی پوری نسل کو نبی بنا دیا اور جس نے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا اس کی نسل میں کوئی نبی و رسول نہیں آیا ہے یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ ایکمرتبہ آوازِ قدرت آئی۔ میرے بندے! پریشان نہ ہو۔ میرے کرم میں کوئی کمی نہیں ہے، میرے خزانۂ قدرت میں کوئی نقص نہیں ہے۔ میں کمالات کا قدرداں ہوں، میں ایثار و قربانی کی عظمتوں کو پہچانتا ہوں۔ میں مصلحت کا انتظار کر رہا ہوں۔ وقت آنے پر میں اپنے کرم کا مظاہرہ کروں گا۔ میرا منشا ہے کہ اس سلسلہ میں پہلی ہی منزل پر تجھے انتظار کا عادی بنا دیا جائے تاکہ آخری منزل پر انتظار میں کوئی زحمت نہ ہو۔

جن لوگوں نے کل نسل اسمٰعیل کے پہلے راہنما کا انتظار کیا تھا وہ آج آخری کا بھی کر رہے ہیں اور جو کل انتظار کے مخالف تھے وہ آج بھی انتظار کی مخالفت کر رہے ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ کل جیسے جیسے نسل اسحٰقؑ کے انبیاء گزرتے جا رہے تھے انتظار شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ اب زمانہ قریب آگیا ہے۔ اب آنیوالا آ رہا ہے اور چونکہ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر جناب عیسٰی تھے اس لئے سب سے زیادہ اس آخری وارث اسمٰعیلؑ پیغمبر کا انتظار انھیں کو رہا ہوگا اور وہ ہر لمحہ اس بات کے منتظر رہے ہوں گے کہ کب خدا اس وارث اسمٰعیل کو بھیجے اور میرے بعد آنیوالا سلسلۂ اوصیاء تمام ہو اور دنیا پھر کسی نبی سے روشناس ہو۔ اور شاید جناب عیسٰیؑ کی یہی ادا قدرت کو پسند آگئی کہ اس نے آواز دی کہ اے عیسٰی تم نے پہلی منزل پر انتظارِ شدید کا شرف حاصل کیا ہے تو آخری منزل پر بھی یہ شرف تمھیں کو عنایت کروں گا۔ آج بھی آسمان پر عیسٰی انتظار کر رہے ہیں اور انشاءاللہ وہ وقت آئیگا جب نسل اسمٰعیل کا

آخری راہنما پردۂ غیب سے ظہور کریگا اور آسمان سے جناب عیسیٰؑ آکر اس کے پیچھے نماز جماعت ادا کریں گے۔ صلوات،

عزیزانِ محترم! یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جناب اسمٰعیلؑ کے بعد اگر ان کی نسل میں انبیاء و مرسلین نہیں آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ ان میں کوئی صاحب کردار اور صاحبِ ایمان نہیں تھا۔ یا کسی کی عظمت و جلالت میں کوئی نقص تھا۔؟ ہرگز نہیں! یہ سب اللہ والے تھے۔ سب کا ایمان توحید پروردگار پر تھا۔ سب اپنے جد حضرت ابراہیمؑ کی ملّت پر قائم تھے۔ فقط عہدوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور وہ اپنے وقت کا انتظار کر رہا تھا اور شاید یہی مصلحت رہی ہو کہ جیسے جیسا عہدہ دینا ہوگا اسکے لئے ویسا ہی زمانہ اختیار کیا جائے گا۔ اور قدرت یہ بتانا چاہتی ہو کہ جس سلسلہ کو ختم کر دینا ہے اس کی نسل کو منصب پہلے دیا جائے گا اور جس کی نسل کے اقتدار کو باقی رکھنا ہے اس کا سلسلۂ منصب بعد میں قائم کیا جائے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نسلِ اسحاقؑ کی منصبی کرامت ختم ہوگئی اور نسلِ اسمٰعیلؑ کی شرافت آج تک قائم ہے۔ آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ نسلِ اسحاقؑ میں ابھی تو جناب عیسیٰؑ زندہ موجود ہیں اور اُدھر بھی ایک نبی قائم و دائم ہے۔ اس لئے کہ جناب عیسیٰؑ کے وجود میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ مسلماتِ اسلام و قرآن میں ہے لیکن ان کی حیثیت نبوت ختم ہو چکی ہے اور اب وہ ایک نمائندۂ پروردگار کی حیثیت سے نہیں ہیں۔ وہ مسلمانوں کے نبی و رسول نہیں ہیں ان کی کتاب منسوخ ہو چکی ہے ان کی شریعت ختم ہو چکی ہے۔ ان کا دور تمام ہو چکا ہے اور ان سب کی زندہ دلیل یہ ہے کہ اب جب وہ آئینگے تو کسی صاحبِ شریعت کو نماز پڑھانے کے لئے نہیں آئیں گے اور جب "صاحبِ شریعت" "وارثِ شریعت" کے پیچھے نماز پڑھ لے تو سمجھ لیجئے گا کہ ایک کی شریعت ختم ہو چکی ہے اور ایک کی شریعت باقی

ہے۔ ایک کے عہدہ کی میعاد ختم ہو چکی ہے اور ایک کا منصب تا قیام قیامت قائم ہے۔ ہے صلوات۔

عزیزانِ گرامی! دامنِ وقت میں گنجائش نہیں ہے اور دامنِ تاریخ میں بھی اتنی وسعت نہیں ہے کہ نسلِ اسمٰعیلؑ کے ایک ایک فرد کی جلالت پر روشنی ڈالی جاسکے۔ البتہ یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ نسلِ اسحاقؑ میں نبوتوں کے سلسلہ کے خاتمہ پر اور جناب عیسیٰؑ کے آسمان پر چلے جانے کے بعد سے امت کی قیادت کا شرف زیادہ حصہ نسلِ اسمٰعیلؑ ہی میں رہا ہے اور یہی وہ افراد تھے جو جزیرۃ العرب میں قوم وملت کی راہنمائی کا فرض انجام دے رہے تھے تقریباً پانچ سو سال تک اوصیاءِ جناب عیسیٰؑ ۔ کون کون تھا اور فریضۂ ہدایت کس کس کے سپرد تھا اس کا تفصیلی تذکرہ تاریخ میں نہیں ہے لیکن اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سلسلہ بہرحال قائم تھا اور زمین حجتِ خدا سے خالی نہیں تھی۔ اب وہ کون تھا جو اس فرض کو انجام دے رہا تھا اس کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ہے۔ البتہ اس دور میں جب اوصیاءِ جناب عیسیٰؑ کے تذکرے اور ان کے تبلیغی کارنامے پردۂ راز میں تھے نسلِ اسمٰعیلؑ کے کارنامے منظرِ تاریخ پر نظر آرہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قدرت اپنی نمائندگی اور امت کی قیادت ورہبری کا کام انہیں نمایاں افراد کے سپرد کر چکی ہے جیسا کہ بعض شخصیتوں کے بارے میں صراحت سے بھی ملتا ہے۔ اسوقت اس موضوع پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ نسلِ اسمٰعیلؑ کے کارنامے منظرِ تاریخ سے ہٹائے نہیں جاسکتے اور صفحۂ تاریخ پر آج تک جگمگا رہے ہیں۔ وہ جناب قصی بن کلاب تھے جنہوں نے عرب کو قیادت کا سلیقہ سکھایا اور مختلف خداؤں میں بٹی ہوئی قوم کو اجتماعی شعور دیا۔ دنیا کو جینے کا انداز سکھایا اور ذلت کے گڑھے میں پڑی ہوئی قوم کو عزت کا احساس بخشا۔ اسی نسلِ اسمٰعیلؑ میں تھے جناب قصی کے نمایاں کارنامے دامنِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ تاریکی کے دور میں منارۂ ہدایت

تھے اور جاہلیت کی فضا میں علم و عمل کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔

جناب قصیٰؑ کے بعد ان کے فرزند جناب عبد مناف کا کردار ہے جن کے ظاہری حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ انھیں "قمر بطحیٰ" کہا جاتا تھا اور باطنی وجاہت و شرافت کے اعتبار سے شعراء یہ اشعار نظم کیا کرتے تھے کہ جب مسافر کو کوئی میزبان نہ ملتا ہو وہ عبد مناف کے گھر چلا جائے۔ فقیر سے امیر ہو جائیگا اور نادار سے دولتمند بنکر واپس آئے گا۔ جناب عبد مناف نے اپنے ماں باپ کی نیابت میں عرب کی سرداری سنبھالی اور خانۂ کعبہ کی تولیت کا کام انجام دیا۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اجتماعی زندگی اور نظم حکومت کا شعور سب سے پہلے حضور سرور کائنات کے جد اعلیٰ جناب قصیٰؑ نے دیا ہے اور اس شعور کو کمال پختگی کا شرف جناب عبد مناف نے بخشا ہے۔

جناب عبد مناف کے بعد ان کے فرزند جناب ہاشم کا دور آتا ہے۔ جن کے کردار کی بلندی کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کا نام ہاشم تھا نہیں ہو گیا تھا، ہاشم کے معنی چور چور کرنے اور ٹکڑے کرنے والے کے ہیں۔ آپکے اس لقب کا راز یہ تھا کہ جب عرب میں قحط پڑا تو آپ سفر تجارت پر گئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی آپ کو اطلاع ملی کہ ملک میں قحط پڑا ہوا ہے فوراً واپس آگئے اور سارا آٹا روٹی کی شکل میں تب۔ کر کے اسے چور چور کر کے عرب کی لذیذ ترین غذا تیار کی اور ساری قوم کو کھلا دیا۔ تاکہ خلقتِ خدا بھوکی نہ رہے۔ انسانوں کا کیا ذکر، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے بھی آپکے کرم سے محروم نہ تھے اور ان کی غذا کا بھی بندوبست فرما دیا کرتے تھے حکومتی معاہدوں کا سنگِ بنیاد جناب ہاشمؑ نے رکھا۔ جب آپ سفر تجارت پر گئے اور قیصر روم سے تعلقات قائم ہو گئے تو آپ نے پہلا کام یہ انجام دیا کہ ملک کے تاجروں پر سے سرکاری ٹیکس اٹھا لیا اور انھیں سفر کی سہولتیں فراہم

کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ جناب ہاشم کے اس احسان کو دنیا عربیت نظر انداز نہیں کر سکتی اور ہر باشعور انسان کو یہ احساس ہے کہ آپ نے اس معاہدے سے عرب کی تجارت کو منزل معراج تک پہنچا دیا ہے۔

جناب ہاشم کے فرزند اور جانشین جناب عبد المطلب تھے جو حضور سرور کائنات کے جد بزرگوار تھے اور جن کی عظمت اس وقت تک یادگار رہے گی جب تک دامن قرآن میں سورۂ فیل محفوظ ہے اور صفحۂ تاریخ پر ابرہہ کا واقعہ ثبت ہے۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاشمی خاندان کی قیادت میں خانہ کعبہ کی بڑھتی ہوئی شہرت و عظمت نے ابرہہ کو بے چین کر دیا اور اس نے دیکھا کہ عقیدۂ توحید مسلسل ترقی کر رہا ہے اور دنیا خانہ کعبہ کے گرد جمع ہو رہی ہے۔ اسے یہ مرجعیت و مرکزیت نہ دیکھی گئی اور اس نے اپنے شہر میں ایک عظیم الشان گرجا بنوا دیا تاکہ لوگ خانہ کعبہ کے بجائے اس کا طواف کریں اور کعبہ کی مرکزیت ختم ہو جائے لیکن چند ہی دنوں میں دیکھا کہ اللہ کا بنایا ہوا گھر اور ہے اور بندے کا بنایا ہوا گھر اور ــــ اتنا زرِ صرف کرنے کے بعد بھی دنیا ادھر متوجہ نہ ہوئی تو بالآخر یہ طے کیا کہ اس خانہ کعبہ کو گرا دیا جائے، اس کی تعمیر کو تباہ و برباد کر دیا جائے تاکہ لوگ اُدھر سے فرصت پا کر ادھر متوجہ ہوں اور اس عزم کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ منزلیں طے کر کے قریب مکہ پہنچا تو آبادی کے قریب پہنچ کر اس کے لشکر نے پہلا کام یہ کیا کہ اہل مکہ کے تمام جانور پکڑ لئے اور جناب عبد المطلب کے اونٹ بھی گرفتار کر لئے، تاکہ اہل مکہ مرعوب ہو جائیں اور کسی قسم کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابرہہ کے اس ارادہ و عزم میں خانۂ کعبہ کا بھی

بھی کوئی قصور تھا؟ اس نے بھی کسی کا کچھ بگاڑا تھا کہ اس کے منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا گیا۔ وہ دنیائے اسلام جواب دیگی کہ نہیں! لیکن کعبہ کی تاریخ اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ باطل بے قصور بھی اہل حق کو تباہ کر دینا چاہتا ہے اور جب باطل حق کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور ذلت کا احساس کرتا ہے تو اس کے پاس ایک ہی حربہ رہ جاتا ہے کہ وہ حق کو تباہ و برباد کر دے تاکہ باطل کو فروغ حاصل ہو اور لوگ حق کی طرف سے منحرف ہو جائیں۔ لیکن یہ بھی تاریخ کا ایک فیصلہ ہے کہ حق بہر حال زندہ رہتا اور باطل بہر حال فنا ہو جاتا ہے۔ دنیائے اسلام اس واقعہ سے سبق لیتی تو بیت اور اہلبیتؑ کے رابطہ کو سمجھ لیتی۔ ابرہہ نے بیت کے مقابلہ میں بت بنایا اور دنیا نے اہلبیتؑ کے مقابلہ میں افراد تیار کئے۔ ادھر بیت کی عظمت نہ گھٹ سکی تو اسے منہدم کرنے کا ارادہ کیا گیا اور ادھر اہلبیتؑ کے وقار میں فرق نہ آیا تو انھیں قتل کرنے کی سازش کی گئی لیکن خدا کا کرم ہے کہ دونوں کی جلالت محفوظ رہی اور آج بیت و اہلبیتؑ دونوں کے دشمن صفحۂ ہستی سے فنا ہو چکے ہیں مکۂ معظمہ میں بیت محفوظ ہے اور پردۂ غیب میں اہلبیتؑ موجود ہے۔ صلوات۔

جناب عبدالمطلب کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ ابرہہ کے دربار میں گئے اس نے نہایت ہی احترام سے بٹھایا اور یہ دلیل ہے کہ جناب عبدالمطلب کی جلالت سے دشمن بھی مرعوب تھے۔ پوچھا کہ عبدالمطلب آپ نے کیوں زحمت کی؟ آپ نے فرمایا کہ تیرے لشکر والوں نے میرے اونٹ پکڑ لئے ہیں۔ میں انھیں واپس لینے آیا ہوں۔ ابرہہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کہنے لگا۔ عبدالمطلب، میں تمہیں بڑا بلند نفس اور عالی ظرف والا سمجھتا تھا۔ تم خانۂ کعبہ کے متولی اور حرم خدا کے محافظ تھے مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمھیں اپنے اونٹ یاد رہ گئے اور اپنے خدا کا گھر یاد نہ آیا کہ اسکے

بارے میں مجھ سے سفارش اور التماس کرتے۔ جناب عبدالمطلب نے تیور بدل کے ارشاد فرمایا۔ ابرہہ! ان اونٹوں کا مالک میں ہوں، ان کی فکر مجھے ہے۔ اور اس گھر کا مالک کوئی اور ہے جو اسے بہر حال بچائے گا تو اب میری کیا ضرورت ہے؟

لہجہ سکون و اطمینان، ایمان و عقیدہ کے استحکام کی غمازی کر رہا تھا کہ اگر آج خدانخواستہ کسی بیت اللہ پر حملہ ہو جائے اور مسلمان یہ کہہ کے الگ ہو جائیں کہ جس کا گھر ہے وہ خود بچائے گا تو سب انھیں اسلام سے خارج کر دیں گے اور ان پر بے حسی کا الزام لگائیں گے کہ خانۂ خدا کا تحفظ واجب ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کے گرانے والے پر عذاب خدا ہی نازل ہو جائے جب کہ خود اسی خانۂ کعبہ پر دور یزید میں حملہ ہوا لیکن نہ کوئی آسمانی لشکر آیا اور نہ کوئی عذاب نازل ہوا۔ تو پھر جناب عبدالمطلب کو یہ کہہ کر الگ ہو جانے کا کیا حق تھا اور ان کی یہ علیٰحدگی کس طرح قابل تعریف ہو گئی۔ اس منزل پر ایک لمحہ ٹھہر کر سوچنا پڑے گا اور ایمان کی عزت و برتری کا اندازہ لگانا پڑے گا کہ اگر آج مسلمانوں کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے اور اس کے کہنے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے کہ ان کے اعلان پر عذاب الٰہی نازل ہو جائے تو کل جناب عبدالمطلب نے یہ کیوں کہا اور عذاب الٰہی کیسے نازل ہو گیا۔ اور عذاب بھی کیسا کہ ابابیل کا لشکر آیا اور کنکریاں پھینک کر ہاتھیوں کو مع سواروں کے تباہ و برباد کر دیا۔ اتنے مختصر سپاہی اور اتنے گرانڈیل جانور۔ لیکن جب اُدھر والا حملہ آور ہوتا ہے تو اِدھر والوں کے قد و قامت کام نہیں آتے اور سب فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

یاد رکھئے! ابابیل اور اصحاب فیل کے واقعہ کو نگاہ میں رکھنے والے مسلمان کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ بیرپاور اور بڑی طاقتوں سے مرعوب ہو جائے۔ خدا بڑی طاقت کو چھوٹی طاقت کے ذریعہ ہی فنا کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ چھوٹی طاقت کا رشتہ خدا سے ہو نا خدا سے نہ ہو۔ صلوات!

جناب عبدالمطلب کے طرزِ عمل کو دیکھنے کے بعد دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ یا تو عبدالمطلب کی نگاہ اتنی دوررس تھی کہ وہ آنے والے عذاب کو دیکھ کر اس کی خبر دے رہے تھے اور اپنے علم غیب کا اعلان کر رہے تھے یا ان کے بیان میں اتنا زور تھا کہ جب کہہ دیا تو عذابِ الٰہی نازل ہو گیا۔ دونوں ہی صورتوں میں ماننا پڑیگا کہ نسل اسمٰعیلؑ میں نبوت کے نہ ہونے کے باوجود ایسے بلند کردار افراد موجود تھے، جن کی باتوں پر آسمانوں میں انقلاب برپا ہو جاتا تھا۔ اور جن کے الفاظ سے عذابِ الٰہی کھنچکر آجاتا تھا۔ صلوات،

جناب عبدالمطلب کے بعد ان کے فرزند جناب ابوطالب اور جناب عبداللہ کا کردار سامنے آتا ہے۔ جناب عبداللہ کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ جناب عبدالمطلب نے یہ نذر کی تھی کہ اگر اللہ نے مجھے دس بیٹے عنایت کئے تو میں ایک بیٹا اس کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ یہ جذبہ خود آواز دے رہا ہے کہ نسل اسمٰعیلؑ میں جذبۂ قربانی موروثی طور پر چلا آرہا ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوا۔ حسن اتفاق کہ معبود نے دعا کو قبول کر لیا۔ اور جب نذر پورا کرنے کا وقت آیا تو قرعہ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ جانمہ سے فرزند کی قربانی کا مسئلہ بہت سخت تھا لیکن عبدالمطلب تیار ہو گئے اور شاعر نے جذبات وفا کی طرف خوب عاشور کے حالات کے ذیل اس طرح اشارہ کیا کہ ؎

حق کیلئے حصارِ وفا گھیرتے ہیں ہم ⁂ بیٹے کے بھی گلے پہ چھری پھیرتے ہیں ہم

لوگوں نے جناب عبدالمطلب سے اصرار کیا کہ اے وارثِ اسمٰعیلؑ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ فدیہ دیدیجئے۔ اور چاند سے فرزند کو بچا لیجئے۔ جناب عبدالمطلب تیار ہو گئے اور طے پایا کہ دس اونٹوں کو فدیہ قرار دیکر قرعہ ڈالا جائے۔ قرعہ ڈالا گیا۔ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ دوسری مرتبہ اونٹ بڑھا کر بیس کر دیئے گئے۔ لیکن قرعہ انھیں کے نام نکلا۔ پھر تیس کئے گئے مگر انھیں کا نام نکلا۔ اور اس طرح دس دس کر کے سو تک نوبت پہنچی۔ اور آخری مرتبہ قرعہ اونٹوں پر نکل آیا جس سے جناب عبداللہ کی جان بچ گئی۔ سو اونٹ راہِ خدا میں قربان ہو گئے اور اسلام نے اپنے دورِ شریعت میں اسی مقدار کو جان کا فدیہ قرار دیدیا۔ کل ابراہیمؑ نے دنبہ ذبح کیا تھا تو قربانی فرض ہو گئی اور آج عبدالمطلب نے سو اونٹ ذبح کئے تو وہی نفس کا بدل بن گیا۔ یہ ہے عظمتِ کردار کہ جو مرتبہ خلق کے بعد ابراہیمؑ کو ملا تھا وہی مرتبہ آج عبدالمطلب کو حاصل ہو رہا ہے۔ صلوات،

یہیں سے نفس عبداللہ کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نگاہِ قدرت میں ان کا مرتبہ کتنا عظیم اور بلند تھا۔ لیکن ان تمام باتوں اور اتنی عظیم اور بلند شخصیتوں کے باوجود سماج کا عالم دگرگوں تھا۔ عالمِ عربیت ایک گہری جہالت میں ڈوبا ہوا تھا عقیدہ، اخلاق، اجتماع، اقتصاد، سماج، فرد، تہذیب، تمدن کوئی ایسا مرحلہ نہیں تھا جہاں انھیں انسان کہا جا سکتا ہو۔ پورا سماج سراپا انتشار بنا ہوا تھا۔

پروردگارا کبتک یہ بت پرستی ہوتی رہے گی اور کبتک خلیل کی ریاضت برباد ہوتی رہیگی۔ معبودا کبتک یہ شراب نوشی اور عیاشی کا رواج رہیگا۔ کبتک لوگ غلام اور کنیز بنتے رہیں گے۔ کبتک سود کے ذریعہ غریبوں کا خون چوسا جائیگا۔ کبتک جوئے کے نام پر

حرام خوری عام ہوگی۔ کب تک بیٹیاں زندہ دفن ہوں گی۔ کب تک ماں بیٹے کیلئے ترکہ و میراث بنتی رہیگی کب تک بھائی بھائی کا خون بہاتا رہے گا۔ کب تک سرِ راہ قافلے لٹتے رہیں گے۔ کب تک انسانیت کا خون ہوتا رہیگا۔ کب تک تہذیب ہیجان اور تمدن بے روح بنا رہے گا۔ کب تک حیأ و غیرت کا نیلام ہوتا رہیگا۔ کب تک شرافت سرِ بازار عریاں ہوتی رہے گی۔ کب تک عزت بکتی جائیگی۔ اور کب تک انبیاء کی ریاضت سکتہ کے عالم میں پڑی رہے گی۔ کیا یہ سماج قابلِ رحم نہیں ہے۔ کیا یہ معاشرہ کسی مہربانی کا حقدار نہیں ہے۔ کیا قربانی اسمٰعیلؑ کوئی منصب نہیں چاہتی۔ کیا سلسلۂ ہدایت و ارشاد کو قیامت تک نہیں چلنا ہے؟

ندائے قدرت آئی۔ میرے بندے ذرا انتظار کر۔ میں نے رحم و کرم کو روک رکھا ہے کہ مسلسل بارش سے پانی کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے اور لوگ بارشِ رحمت کو بھی زحمت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن جب تھوڑی پانی برس جاتا ہے اور چند روز تک بارش نہیں ہوتی تو ہوا کے حبس اور فضا کی گھٹن ہی کو دیکھکر بارش کی دعائیں ہونے لگتی ہیں اور پھر ایک ایک قطرۂ آب کو دُرِّ آبدار کا مرتبہ دیا جاتا ہے۔ میں نے عیسٰیؑ کے بعد نبوت کو اسی لئے روک لیا تھا کہ انسانوں کو نبی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے اور انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ بظاہر انبیاء نہیں رہتے ہیں تو سماج کا کیا عالم ہوتا ہے اور جب یہ احساس بیدار ہوگیا اور ساری کائنات فریاد طلب ہوگئی ہے تو دیکھ! وہ مکہ سے ایک گھٹا اٹھ رہی ہے۔ وہ خانۂ عبدالمطلب سے ابرِ گوہر بار اُمنڈ رہا ہے۔ وہ ۱۷ ربیع الاول کی صبح کو غنیمت کا ابر گہربار بارشِ رحمت کر رہا ہے۔ وہ دنیا جل تھل ہو رہی ہے۔ وہ کھیتیاں ہری بھری ہو رہی ہیں۔ وہ سبزہ لہلہا رہا ہے۔ وہ ریاضت انبیاء کام آ رہی ہے۔ وہ قربانی اسمٰعیل گُل کھلا رہی ہے۔ وہ نسلِ ابراہیم پر بہار آرہی ہے۔ وہ باغِ رسالت

کا آخری پھول کھل رہا ہے۔ اور خارزارِ عالم کو دائمی گلزار بنا رہا ہے صلوات۔

اور ربیع الاوّل کی صبح کیا سعادت نشاں صبح تھی جب گلزارِ خلیلی میں بہار آ رہی تھی اور آمنہ کی گود میں عرب کا چاند چمک رہا تھا۔ قصرِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گرتے ہوئے آواز دے رہے تھے کہ چودہ انوارِ حق کا حامل آ رہا ہے۔ بحرِ ساوہ خشک ہو کر پکار رہا تھا کہ اس کی سخاوت کے سامنے دریا میں مجالِ روانی نہیں ہے۔ آتش کدہ فارس گل ہو کر آواز دے رہا تھا کہ ایک وارثِ خلیل آ رہا ہے۔ کائنات میں انقلاب برپا تھا۔ روحِ تہذیب و تمدن رقص کر رہی تھی۔ اسلام سرفراز ہو رہا تھا کفر کی بستی میں ایک کھلبلی مچی تھی اور عالمِ بالا میں جشنِ مسرت منایا جا رہا تھا۔

آنے والا اوّل مخلوقات ہونے کے باوجود اتنی دیر میں آ رہا ہے اور اسے اوّل کے بجائے آخر بنایا جا رہا ہے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ جتنی بڑی شخصیت کو آنا ہوتا ہے ویسا ہی انتظام کیا جاتا ہے معمولی حکام کی آمد کا انتظام چند لمحہ قبل شروع ہو جاتا ہے اور بڑی شخصیت کی آمد کا اہتمام چند روز اور چند ماہ قبل سے ہوتا ہے۔ مالکِ کائنات اپنے آخری حبیب صاحبِ معراج کو بھیجنے والا تھا۔ اس نے پہلے تمہید میں انبیاء کو بھیجا تاکہ زمین ہموار کریں۔ اس کے بعد اوصیاء کا سلسلہ قائم کیا کہ قوم قبولِ احکام کیلئے تیار ہو جائے۔ اس کے بعد مخصوص برگزیدہ بندوں کو مقرر کیا کہ وہ اپنے کردار سے قبول ہدایت کیلئے ذہن تیار کریں۔ اور اس طرح جب پورا ماحول تیار ہو گیا تو اپنے محبوب کو عرشِ اعظم سے فرشِ مکہ پر اتارا اور اس شان سے اتارا کہ گویا آدم صفوت لیکر آ رہے ہیں۔ نوح زہد سمیت آ رہے ہیں۔ ابراہیم خلت و دوستی آ رہے ہیں۔ موسیٰ تکلم بدست آ رہے ہیں۔ عیسیٰ مُردہ جلاتے ہوئے

آ رہے ہیں۔ قصئی تاجِ سیادت پہنے ہوئے آ رہے ہیں۔ عبد مناف کلید کعبہ لئے ہوئے آ رہے ہیں۔ ہاشم سخاوتوں کے دریا بہا رہے ہیں۔ عبدالمطلب جذبۂ قربانی کی معراج دیکھ رہے ہیں۔ عبداللہ شانِ بندگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور معراج کی رات کا دولہا "فرازِ عرش سے زمینِ مکّہ کی طرف آ رہا ہے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی بڑی شخصیت کو آنا ہوتا ہے تو اس کے شایانِ شان انتظامات بھی کئے جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے کئے جاتے ہیں کہ ان کو دیکھنے والا دور ہی سے اندازہ کر لے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے اور کون آنے والا ہے۔ سیاسی شخصیتوں کے لئے انتظام الگ ہوتا ہے اور مذہبی شخصیت کے لئے الگ۔ غم والوں کا انتظام اور ہوتا ہے اور خوشی والوں کا اہتمام اور۔ صاحبانِ فن اس نکتہ سے باخبر ہیں اور اسی اعتبار سے انتظام بھی کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مالکِ کائنات نے اپنے محبوب کو بھیجنے کیلئے کیا اہتمام کیا؟ جس سے آپ کی شخصیت کا بھی اندازہ ہو اور آپ کے مقاصد عالیہ کا بھی انکشاف ہو جائے۔ ذریت اسمٰعیل سے جناب عبداللہ تک مسلسل صاحبِ ایمان و کردار کا آنا اور اپنے طور پر دینِ خدا کی حفاظت کرنا دلیل ہے کہ آنے والا عظیم شخصیت اور بلند ترین ترکات کا وارث ہے اور اسے جملہ تبرکات کا حامل بنا کر بھیجا جا رہا ہے اور مقاصد کے اعتبار سے کبھی عجیب و غریب انتظام ہے اور ایسا بلند انتظام ہے جسے انسان دور سے دیکھتے ہی اندازہ کر لے کہ آنے والے کے عزائم و مقاصد کیا ہیں۔ اور وہ کن اقدار و مفاہیم کو پھیلانے کے لئے آ رہا ہے۔

اسلام دو عظیم رشتوں کا جامع مذہب ہے۔ ایک خالق و مخلوق کا رشتہ

اور ایک مخلوق کا رشتہ ۔ اسکے احکام انھیں دو رشتوں کے جامع اور اس کے دین کی وسعت و ہمہ گیری انھیں دونوں رشتوں سے وابستہ ہے ۔ اس کا مقصد پہلے رشتہ سے یہ ہے کہ روئے زمین کا ایک ایک بسنے والا بارگاہ بے نیاز میں سر تسلیم جھکائے اور ساری دنیائے انسانیت عبادت گذار بنجائے اور دوسری منزل میں اسکا مقصد قیام امن ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ بندے آپسمیں اسطرح زندگی گذاریں کہ امن و امان قائم رہے اور کسیطرح کا فساد و اختلاف نہونے پائے

بانئ اسلام انھیں دونوں مقاصد کی تکمیل کیلئے آیا ہے ۔ قدرت نے چاہا کہ اسے ایک ایسے ماحول میں بھیجا جائے کہ ہر دیکھنے والا دونوں مقاصد کا اندازہ کرلے ۔ اسنے ایکطرف جناب عبداللہ کا صلب اختیار کیا اور دوسری طرف جناب آمنہ کا بطن ، ظاہر ہے صلب عبداللہ آواز دے رہا ہے کہ آنیوالا عبدیت کا علمبردار بنکر آرہا ہے اور آمنہ کے بطن اقدس کا اشارہ ہے کہ آنیوالا امن عالم کا ذمہ دار بنکر آرہا ہے ۔ اب اگر صحیح زندگی گذارنا ہے تو اسی عبدیت کا سبق بھی لینا اور امن و امان کا بھی ۔ عبدیت چھوڑ دوگے تو خدا سے مایوس ہو جاؤگے اور امن و امان کا لحاظ نہ کروگے تو سماج میں زندہ نہ رہ سکوگے ۔ زندہ رہنا ہے تو عبداللہ کے لال کا کلمہ پڑھنا اور سکون و اطمینان سے زندگی گذارنا ہے تو آمنہ کی گود کے پالے کی آغوش محبت میں پناہ لینا ۔ صلوات ۔

مرسل اعظم اس دنیا میں آئے اور یہ اعلان کرتے ہوئے آئے کہ جب زمانہ فسق و فجور سے بھر جاتا ہے ۔ جب انسانی قدریں پامال ہونے لگتی ہیں ۔ جب لا مذہبیت اور الحاد کا دور دورہ ہو جاتا ہے ۔ جب ظلم و جور عوام سے حکام تک عام ہو جاتے ہیں تو رب کریم اپنی رحمت کاملہ سے ایک محمد کو بھیجدیتا ہے اور اس کے ذریعہ کائنات ظلم کو منقلب کر دیتا ہے اور یہ اشارہ ہے کہ جسطرح پہلے دور ظلم میں پہلے محمد کو بھیجا تھا اس طرح آخری دور ظلم و جور میں آخری محمد کو پردۂ غیب سے باہر لائے گا ۔ صلوات ۔

پہلی مجلس داستانِ عزیمت سرکارِ دو عالمؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان علینا للھدیٰ وان لنا للآخرۃ والاولیٰ

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ اور دنیا وآخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر راہنماؤں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے تاکہ انسان یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری ہدایت کا انتظام نہیں ہوا اور ہم راہِ راست پر نہیں آسکے۔ ہم نے آدمؑ جیسا مسجود ملائکہ بھیجا۔ ہم نے نوحؑ جیسا طوفان آزما بندہ معین کیا۔ ہم نے ابراہیمؑ جیسا بت شکن مبعوث کیا۔ ہم نے موسیٰؑ جیسا تموج شکن راہنما بھیجا۔ ہم نے عیسیٰؑ جیسا مسیحا پیدا کیا اور پھر آخری منزل پر ایک عرش نشین بندہ کو فرش زمین پر آتار دیا کہ تعلیم ہدایت مکمل رہے۔ اور اس میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ ہم نے اپنے محبوب کی جدائی برداشت کر لی، لیکن انسانیت کی تباہی برداشت نہیں کی۔ ہم نے صاحبِ عرش کو فرش نشین بنا دیا لیکن بادیہ نشینوں کا بھٹکنا گوارہ نہیں کیا۔ یہ ہمارا کرم تھا کہ ہم نے رسولؐ بھیجا اور یہ ہمارے رسولؐ کا ظرف تھا کہ اس نے دنیا کی ہدایت کی خاطر عرش کا ماحول چھوڑنا گوارا کیا اور یہ تمہارا اندازِ زندگی ہے کہ تمہیں اس کا کلمہ پڑھنا بھی گوارا نہیں ہے۔

دنیائے انسانیت عدل وانصاف سے کام لیتی تو اسے اندازہ ہوتا

کہ ایک کلمہ کی کیا حقیقت ہے۔ ساری زندگی حضور سرورِ کائنات کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کے بعد بھی ان کے حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے ہمارے لئے منزلِ معراج "عرشِ الٰہی" کو چھوڑا ہے اور ہم نے ان کی اطاعت کے طفیل معراج حاصل کی ہے۔ وہ معراج میں بھی گئے تو امت کیلئے تحفۂ نماز لے کر واپس آئے اور ہم مصلٰی پر بھی گئے تو منزلِ معراج کی تمنا ہی لے کر گئے۔ صلوات،

دنیا میں کون ہے جو سرکارِ دوعالمؐ کے احسانات کا بدلہ ادا کر سکے اور آپکی بے پناہ محبتوں کا صلہ دے سکے۔ آپکی بعثت کو خود خدائے کریم نے احسان قرار دیا ہے اور آپکی آمد کو خود رب العالمین نے نزولِ رحمت سے تعبیر کیا ہے اور آپکی زندگی کو آپکے خون کے پیاسوں نے بھی بلند و بالا تسلیم کیا ہے۔ آپ پتھر کھاتے رہے لیکن صداقت کا کلمہ پڑھواتے رہے۔ کانٹوں پر چلتے رہے لیکن امانت و دیانت کے خارزار کو گلستاں بناتے رہے۔ آج مجھے انھیں سرورِ دو عالمؐ کا تذکرہ کرنا ہے۔ اور انھیں کی سیرتِ مبارکہ پر ہلکی سی روشنی ڈالنا ہے۔ مکمل تبصرہ تو کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کسی کی سیرت میں ایک پہلو ہوتا ہے تو اس کی وضاحت آسان ہو جاتی ہے اور کسی کی زندگی میں ایک کمال ہوتا ہے تو اس کی تفصیل ممکن ہو جاتی ہے لیکن جس کی زندگی سراپا کمال ہو، اور جس کا کردار سراپا اعجاز ہو اس کے کمالات پر کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ اور اس کے فضائل کون بیان کر سکتا ہے۔ اس کی توصیف کے لئے اللہ کا لہجہ درکار ہے۔ قرآن کی زبان لازم ہے۔ اعجاز کا انداز ضروری ہے روح الامین کا ترنم لازم ہے، مولائے کائنات کا ظرف درکار ہے۔ اسلام کی روح لازم ہے اور ایمان کی حیات درکار ہے۔

کوثر کی روانی ہو تو اس کی سخاوت کا بیان کیا جائے۔ جنّت کی نکہت ہو تو اس کے پسینہ کی توصیف کی جائے۔ سلسبیل کا تموّج ہو تو اس کے خرام ناز کا تذکرہ کیا جائے۔ جبرئیل کا لہجہ ہو تو اس کے اندازِ تکلم پر روشنی ڈالی جائے اور علیؑ کا انداز ہو تو اس کے جوش و جلال کا نقشہ کھینچا جائے اور دنیا کے کسی انسان میں یہ باتیں ممکن نہیں ہیں۔ اس لئے اس کی توصیف بھی ممکن نہیں ہے، یہ مالکِ کائنات کا کرم تھا کہ اس نے توصیف کے کچھ اسباب فراہم کر دیئے اور آواز دی کرائے میرے بندے! اگر میرے حبیب کا کردار سمجھنا ہے، میرے پیغمبر کی زندگی کا نقشہ کھینچنا ہے، میرے محبوب کے کمالات کا اندازہ کرنا ہے تو قرآن کا انداز لے لے علیؑ کا کردار لے لے، حسنؑ کا اخلاق لے لے، حسینؑ کا صبر و استقلال لے لے، سجادؑ کی عبادت لے لے، باقرؑ کا علم لے لے، صادقؑ کی صداقت لے لے، کاظمؑ کا حلم لے لے، رضاؑ کی شانِ تسلیم لے لے، تقیؑ کا تقویٰ لے لے، نقیؑ کی پاکیزہ زندگی لے لے، عسکریؑ کا جلال لے لے، اور مہدیؑ کا اندازِ ہدایت لے لے۔ صلوات،

جب یہ اسباب فراہم ہو جائیں گے تو میرے حبیب کی توصیف ممکن ہو جائے گی اور جب یہ آئینے سامنے لگ جائیں گے تو میرے حبیب کا کردار نظر آنے لگے گا۔ میں نے یہ آئینہ خانہ اسی لئے بنایا ہے کہ ہر دور میں میرے پیغمبر کی تصویر دیکھی جا سکے اور ہر زمانہ میں میرے حبیب کے کردار کا نقشہ نظر آ سکے۔ میرا انتظام اتنا دائمی اور ابدی ہے کہ خود میرے حبیب کو کہنا پڑا کہ میرا آخری وارث میرا ہم مقصد بھی ہوگا اور ہم نام بھی، ہم صورت بھی ہوگا اور ہم سیرت بھی، ہم شکل بھی ہوگا اور ہم رتبہ بھی۔ اس کا نور میرا نور ہوگا اور اس کا ظہور میرا ظہور ہوگا۔ اس کی رفتار میری رفتار ہوگی اور اس کی گفتار میری گفتار ہوگی، اس کا کردار میرا کردار ہوگا اور اس کا انداز میرا انداز ہوگا، اس کا لہجہ میرا لہجہ ہوگا اور اس کا تکلم میرا تکلم، اس کی حیات میری حیات ہوگی اور

حدیہ ہے کہ اس کا نام میرا نام ہوگا اور اس کی کنیت میری کنیت یعنی اس کے اور میرے اندازمیں برائے نام بھی فرق نہ ہوگا۔صلوات،

ایسے حبیب کی ایسی پاکیزہ سیرت پر روشنی ڈالنا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور ہمیں بعض مسلمانوں کا یہ الزام بسروچشم قبول ہے کہ ہم نے پیغمبر اسلام کو کما حقہ نہیں پہچانا اور ہمیں سرکار کی مکمل معرفت حاصل نہیں ہو سکی۔ ہم اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اور نہ اس اعلان میں کوئی توہین سمجھتے ہیں۔ ہمیں تو اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم نے سرکار کا مکمل عرفان نہیں حاصل کیا۔ ہم نور ہوتے تو نور کی حقیقت کو سمجھتے، ہم پیغمبر ہوتے تو پیغمبری کی صحیح عظمت سے آشنا ہوتے۔ ہمیں مرکز وحی بنایا گیا ہوتا تو ہم وحی کی کیفیت کا اندازہ کرتے، ہم پر قرآن نازل ہوتا تو ہم حقیقت قرآن سے باخبر ہوتے۔ ہمیں مرتبہ ختم نبوت دیا جاتا تو ہم ختم نبوت کی منزل سے روشناس ہوتے۔ اور جب ایسا کچھ نہیں ہے تو ہمارا کمال کردار یہی ہے کہ ہم اپنی عاجزی کا اقرار کرلیں اور یہ اعلان کردیں کہ سرکار ہم نے آپکو اتنا ہی پہچانا ہے کہ آپ ہمارے ذہنوں سے بالاتر ہیں۔ ہمارے دماغوں سے بلند تر ہیں۔ ہماری فکر سے ماوراء ہیں۔ ہماری نظر سے دور ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب ہم آپ کے وصی کو نہ پہچان سکے اور اس نے اعلان کردیا کہ تمہارا طائر فکر میری بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا تو ہم آپکو کیا پہچانیں گے۔صلوات،

سیرت وکردار کو سمجھنے کے لئے چند باتوں کا سمجھنا بے حد ضروری ہوتا ہے اور ان کے بغیر سیرت کا تجزیہ نامکمل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ صاحب کردار نے اپنے بزرگوں سے کیا لیا ہے اور اپنے بعد والوں کو کیا دیا ہے اس کے بعد یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس نے اپنے سماج اور معاشرہ سے کیا لیا ہے۔

اور اپنے سماج اور معاشرہ کو کیا دیا ہے۔ اور پھر اس کے ذاتی اوصاف و کمالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ان صفات و کمالات سے دنیا کو کیا حاصل ہوا اور اس کے فضائل اس کی ذات تک محدود رہے یا اس سے دوسروں کو بھی فیض حاصل ہوا — اس نے صرف اپنے لئے زندگی گزاری ہے یا اپنے سماج کو بھی کچھ دیا ہے اور اس کی بھی کوئی خدمت کی ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس نے جس ماحول میں کام کیا ہے اور جن حالات میں زندگی گزاری ہے وہ حالات کیا تھے اور وہ ماحول کیسا تھا۔ دنیا اس کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار تھی یا اسے فنا کے گھاٹ اتارنے پر آمادہ تھی۔ سماج کا ذہن اس کے پیغام کے لئے ہموار تھا یا اسے ستانے کے لئے تیار تھا۔ حالات کے دباؤ میں آکر اس نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی کی ہے یا اپنے موقف پر برابر قائم رہا ہے۔

سرورِ کائنات کی حیات طیبہ کا جائزہ لینے کے لئے انھیں امور کا تجزیہ ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ مختصر سے وقت میں اتنی طویل داستان نہیں چھیڑی جا سکتی اور تھوڑے سے وقفہ میں عالم انوار سے لیکر صبح محشر تک کے کمالات کا نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ وہ ذہن کہاں سے آئے جو عالم انوار کی تصویر کھینچ سکے۔ وہ ظرف کہاں سے پیدا ہو جو صبح محشر کی منظر کشی کر سکے۔ وہ علم کہاں سے آئے جو حضور کے کمالات کا احاطہ کر سکے اور وہ فکر کہاں سے پیدا ہو جس میں سرکار کا کردار سما سکے۔ جب یہ شرف انبیاء و مرسلین کو نہیں مل سکا تو ہمیں اور آپ کو کہاں سے ملے گا۔ اور اس منزل کمال پر روح الامین عاجز رہے ہیں تو ہم اور آپ کہاں تک پرواز کر سکیں گے۔ چند لمحوں میں صرف ایک خاکہ کھینچ دینا چاہتا ہوں اور بات کو کسی ایک منزل تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔

جہاں تک سرکار دو عالم کی نسلی شرافت و عظمت کا تعلق ہے، دنیا جانتی ہے کہ آپ نسل ابراہیمؑ اور ذریت اسمٰعیلؑ میں تھے۔ آپ کو میراث میں جذبۂ قربانی اور حوصلۂ ایثار ملا تھا۔ جناب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے بعد آپ کے جملہ آباء و اجداد طیبین و طاہرین اور اللہ کے پرستار تھے۔ آپ کے کسی بزرگ نے بتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا اور باطل کو سجدہ نہیں کیا۔ سب اس دعائے ابراہیمؑ کا ثمرہ بن کر دنیا میں آئے کہ "پروردگا۔ مجھے اور میری ذریت کو بت پرستی سے محفوظ رکھنا" آپ کے بزرگوں میں جناب قصی بن کلاب جیسا سردار قریش، جناب عبد مناف جیسا ذمہ دار حرم، جناب ہاشم جیسا سخی و نیک دل، جناب عبدالمطلب جیسا صاحب ایمان و کردار، جناب عبداللہ جیسا ذبیح اللہ، جناب آمنہ جیسی پاکیزہ سیرت خاتون اور جناب ابوطالب جیسا جانباز و شیر دل چچا تھا۔ بزرگوں سے ترکہ میں شرافت و نجابت، سیادت و قیادت، سخاوت و عدالت، ایمان و کردار، تقویٰ و طہارت، قربانی و ایثار، ہمت و عزم، صبر و استقلال کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اور ایک انسان کی کردار سازی کے لئے یہ ترکہ بہت کافی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ الٰہی منصب دار بھی ہو۔ جہاں نہ کسی کی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تربیت کی، وہ نہ کسی کی آغوش کا محتاج ہوتا ہے، نہ ماحول کا۔ اس کی تعلیم صرف درسگاہ رب العزت میں ہوتی ہے اور اس کی تربیت صرف دست قدرت سے انجام پاتی ہے اور ایسے حالات میں کردار کی عظمت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ صلوات،

آپ نے اپنے بعد والوں کو کیا دیا۔ یہ اس کے لئے بھی کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف باسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنے بعد

کے لئے وہ نسل چھوڑی ہے جس کا ایک ایک فرد بے نظیر اور ایک ایک شخصیت لاجواب ہے۔ بیٹی ہے تو باپ کے لئے قابل تعظیم۔ پروردۂ آغوش بھائی ہے تو نصیری کا خدا۔ نواسے ہیں تو اسلام کی عزت و آبرو۔ ذریت ہے تو دین و ایمان کی محافظ۔ اور آخری فرزند ہے تو عیسیٰ بن مریم کا امام۔ صلوات،

یہ صحیح ہے کہ ان میں ہر فرد تعلیم و تربیت سے بے نیاز ہے اور سب بارگاہِ رب العالمین کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ عالمِ معنیٰ میں اولیاء کے کمالات میں نبوت بہرحال واسطہ ہوتی ہے۔ اور وہی تک کوئی مرتبہ نبوت کی نیابت ہی میں پہنچتا ہے۔ اس لئے اللہ نے جو کچھ بھی عطا کیا ہے اور جب بھی عطا کیا ہے نبی کو واسطہ ضرور بنایا ہے تاکہ شانِ نیابت و جانشینی محفوظ رہے اور دنیا دھوکہ نہ کھا جائے اور اسی لئے مولائے کائنات فرمایا کرتے تھے کہ مجھے رسول اللہ نے ہزار باب تعلیم کئے ہیں اور میں نے ہر باب سے ہزار باب نکالے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ جو اتنا صاحب صلاحیت ہو کہ ایک ایک باب سے ہزار ہزار باب نکال سکے وہ کسی کی تعلیم کا محتاج کیا ہوگا علیؑ چاہتے تھے کہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ میں وصی رسولؐ ہوں اور وصی کا کام نبی کے واسطہ سے آتا ہے۔ مجھے پیغمبر نے دنیا میں تعلیم نہیں دی ہے لیکن میرا کمال انھیں کے واسطے سے ملا ہے۔ صلوات،

رسولِ اعظمؐ کو اپنے سماج سے کیا ملا۔؟ یہ داستان بڑی دردناک ہے آپ جس سماج میں مبعوث ہوئے وہ اتنا پست اور ذلیل تھا کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو اس سماج میں موجود نہ ہو۔ ذہنی اعتبار سے اتنے پست کہ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے تھے اور انھیں بالاتر

قیامت یہ کہ صبح کو حلوے کے خدا بناتے تھے اور شام کو بھوک لگنے پر انہیں کو کھا جاتے تھے۔ آپ خود سوچیں کہ جو قوم اپنے خدا کو معاف نہ کر سکتی ہو اور اس کو ہضم کر جاتی ہو وہ دوسرے خدا کے بندوں کو کیوں کر معاف کر سکتی ہے

اخلاقی اعتبار سے اتنے ذلیل کہ زنا عام، بدکاری شرف، عیاشی طرۂ امتیاز، نہ کوئی عزت نہ کوئی احترام، نہ کوئی شرافت نہ کوئی نجابت، چوری، ڈکیتی، رہزنی، شراب خوری، سود، جوا اور ایسی تمام برائیوں کے سراپا عادی تھے۔

خیالات اتنے غلیظ کہ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا شرف، عزیزوں کا خون بہا دینا شجاعت، قبائل کو تہہ تیغ کر دینا ہمت، قوموں میں فساد کرا دینا عزت اور انسانیت کا خون بہا دینا باعث امتیاز و انفرادیت تھا۔

ایسی قوم کے لئے کیا دشوار تھا کہ اگر کوئی اس کے اپنے مذہب کے خلاف آواز بلند کرے اور اپنے خود ساختہ خداؤں کو باطل قرار دے تو اس کی راہ میں کانٹے بچھائیں، اس پر پتھروں کی بوچھار کریں، اس کی زندگی کے درپے ہو جائیں اور اس کی پوری نسل کو تباہ و برباد کر دیں، لیکن کیا کہنا اس کریم النفس انسان کا اور کیا کہنا اس رحیم و کریم پیغمبرؐ کا کہ اس نے سماج کے اتنے مظالم دیکھنے کے باوجود مقابلہ کرنا کیسا کبھی بد دعا بھی نہیں کی، پتھر مارنے والوں کو دعائیں دیں، کانٹے بچھانے والوں کو گلے لگایا، جان کے دشمنوں کو زندگی کا پیغام دیا، اخلاق کے مارے ہوئے افراد کو باکردار بنایا، شرابیوں کو عقل و ہوش کا سبق سکھایا، بدکرداروں کو نیک کردار بنایا، جواریوں کو اکل حلال کا سلیقہ بتایا، سود خوروں کو ایثار کا سبق دیا، بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے والوں کو بیٹیوں کی تعظیم بتائی، بھائیوں کے قاتلوں کو مواخات کا سبق

دیا، قبائل سے دشمنوں کو محبت کا خوگر بنایا، رہزنوں کو راہِ ہدایت دکھائی اور ڈاکوؤں کو جہادِ راہِ خدا کا راستہ دکھایا، غربت و پریشانی کا ذکر نہیں ہے، اس نے ہر حال میں قوم کے حال پر رحم کیا۔ وطن سے نکالا گیا لیکن فاتحانہ انداز سے داخلہ کے تحت بھی انتقام نہیں لیا بلکہ امان ہی دی اور آزاد ہی کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آمنہ کا لال امن کا پیغام ہی دینے آیا تھا اور عبداللہ کا فرزند عبدیت کے نام پر آزادی کا درس ہی دینے والا تھا۔ صلوات،

نبی نے اپنے سماج کو کیا دیا۔؟ اس کا اندازہ اس دن ہوا جب مکہ فتح ہوا، اور آپ نے دشمنوں سے سوال کیا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو؟ اور سب نے بیک زبان کہا کہ جو ایک کریم ابن کریم سے امید رکھی جا سکتی ہے۔ مرسلِ اعظم نے عام معافی اور امن و امان کا اعلان کر کے بتا دیا کہ صلح و آشتی کے ماحول میں کردار کا اقرار لینا بہت آسان ہے اور متعدد خونریز جنگوں کے بعد کرم کا کلمہ پڑھوا لینا بہت مشکل ہے۔ میرے کردار کے آغاز و انجام کو ملا کر دیکھو تو میری زندگی کا راز سمجھ میں آجائے گا، میں نے ابتدائی زندگی ایسی گزاری کہ مجھے کچھ نہ سمجھنے والوں نے بھی صادق و امین کہا اور آخری زندگی اس شان سے گزاری کہ میرا مقابلہ کرنے والے بھی مجھے کریم ابن کریم ہی کہہ رہے ہیں۔ صلوات،

لیکن اس مقام پر یہ یاد رکھنے کا کہ سرکار کی معافی کا تعلق سرکاری جرائم ہی سے ہوتا ہے، عوام کے مجرمین کو معاف کرنے کا حق سرکار کو نہیں ہے، ورنہ یہ ظالموں سے ہمدردی اور کمزوروں کے حق میں ایک نیا ظلم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حق العباد کو پروردگار بھی معاف نہیں کرتا۔ اب جو لوگ اسلامی انقلاب پر اعتراض کرتے ہیں انہیں اس نکتہ پر بھی نگاہ رکھنا چاہیے،

اور اسلامی قانون کو برطانوی قانون کے معیار پر نہیں پرکھنا چاہیئے۔ اسلام ایک مستقل قانون ہے برطانیہ کا تابع نہیں ہے اور نہ اس میں عوامی جرائم میں مراحم خسروانہ کی کوئی گنجائش ہے۔!

عزیزانِ محترم! مجھے اس موقع پر ایک منظر اور یاد آ گیا جب صفین کے میدان میں علیؑ کے لشکر نے شام کے لشکر کو شکست دے کر دریا پہ قبضہ کر لیا اور شام کے قبضہ کو ہٹا دیا تو لشکرِ علیؑ کو پیاس سے مارنے والوں کے لشکر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اب علیؑ ہم سے انتقام لیں گے اور ہم پیاس سے تباہ ہو جائیں گے۔ شدہ شدہ یہ فریاد حاکم شام "معاویہ بن ابی سفیان" تک پہنچی۔ اس نے آواز دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ علیؑ بڑے کریم ہیں، تم پانی کا مطالبہ کرو وہ کبھی پانی بند نہ کریں گے۔

عزیزانِ گرامی! منظر کو منظر سے ملا کر دیکھ لیجئے کردار کی عظمت کا اندازہ ہو جائیگا۔ کل نبیؐ تھے اور معاویہ کا باپ ابوسفیان تھا، اور آج علیؑ ہیں اور ابوسفیان کا بیٹا معاویہ ہے۔ کل باپ نے نبیؐ کے کرم کا اقرار کیا تھا اور آج بیٹا علیؑ کے کرم کا اعتراف کر رہا ہے۔ پہچانا آپ نے کون کس کا وارث ہے۔ اور کس کے پاس کس کی سیرت ہے۔ شام تک ابوسفیان کا اندازہ پہنچا ہے اور علیؑ تک محمد مصطفےٰؐ کا کردار آیا ہے۔ صلوات،

نبی اکرمؐ کی سیرت گواہ ہے کہ آپ نے اپنے سماج کو دیا ہی ہے اس سے کچھ لیا نہیں۔ سماج سے لیا ہوتا تو بت پرست ہوتے، شراب خوار ہوتے، قمار بازی فرماتے، سود کے عادی ہوتے، قاتل و سفاک ہوتے، اور معاشرہ کی برائیوں کے حصہ دار ہوتے، لیکن آپ کی زندگی میں ان باتوں کا تصور

بجز نہیں ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے سماج سے کچھ لیا نہیں ہے۔ بلکہ اسے کچھ دیا ہی ہے اور اتنا عطا کیا ہے کہ شراب خواروں کو متقی بنا دیا ہے۔ قمار بازوں کو کریم بنا دیا ہے۔ سود خواروں کو غنی بنا دیا ہے۔ قاتلوں کو شہید بنا دیا ہے۔ خونریزوں کو مجاہد بنا دیا ہے۔ پتھروں کے پجاریوں کو وحدہٗ لاشریک کا بندہ بنا دیا ہے۔

حد یہ ہے کہ عرب کے امتیازی کمال فصاحت و بلاغت اور زبان دانی سے بھی آپ نے کچھ لیا نہیں اور اس میدان میں بھی انھیں کچھ دیا ہی ہے۔ ان سے لیا ہوتا تو انھیں کے انداز میں گفتگو کرتے اور ساری فصاحت و بلاغت اونٹ، گھوڑا، تلوار، شراب اور عورت کی نذر ہو جاتی، لیکن انھیں دیا اور اتنا دیا کہ اونٹ، گھوڑے، شراب، عورت اور تلوار کے پرستاروں کو توحید، عدالت، نبوت، امامت، قیامت، جنت و جہنم، زمین و آسمان، معاش و معاد کے جیسے اہم موضوعات دے دیئے اور عورتوں کے ظاہری حسن اور معشوق کے کھنڈرات کا ماتم کرنے والوں کو الحمد للہ کہنے کا سلیقہ سکھا دیا۔

تاریخ عرب گواہ ہے کہ حضور اکرمؐ بھی سماج کے پروردہ اور معاشرہ کے پابند ہوتے تو عرب میں سبع معلقات ہوتے قرآن حکیم نہ ہوتا، مسحور کن خطابت و شاعری ہوتی معجز نما کلام نہ ہوتا، یہ حضور سرورِ کائناتؐ کا احسان ہے کہ آج دنیائے عربیت ساری کائنات کو چیلنج کر سکتی ہے اور اسے یہ کہنے کا حق ہے کہ معجز نما کلام صرف ہماری زبان میں آیا ہے اور کسی زبان میں نہیں ہے۔ اعجاز کے لہجہ میں صرف ہم گفتگو کرتے ہیں کسی اور قوم کو اس لہجہ میں گفتگو کرنے کا حق نہیں ہے۔ صلوات

اس کے بعد ایک نظر حضورؐ کے ذاتی فضائل و کمالات پر ڈال لیجئے کہ آپ نے

زندگی کے یہ عظیم کارنامے کس ماحول میں انجام دیئے ہیں اور کتنے مختصر وقت میں کتنا اہم کام کیا ہے۔

جہاں تک ذاتی کمالات کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ یہاں زبان کھولنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے برابر ہے اور اس موضوع پر بھی بحث کرنے کی ضرورت ہوتی اگر کسی نے کمال کے انکار کرنے کی ہمت کی ہوتی اور جب دشمن تک کمال کے معترف ہیں تو تفصیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ذکر خیر کی افادیت کے پیش نظر چند کلمات کافی ہیں۔

آپ کے علم کو دیکھا جائے تو آپ کے اس دنیا میں آنے کی غرض ہی یہ ہے کہ قوم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں اور ان کے درمیان تلاوت کتاب کریں۔ یعنی دنیا میں آکر تعلیم حاصل کرنے والے اور ہیں اور دنیا کو تعلیم دینے کے لئے آنے والے اور ہیں۔ یہ آپ کے الٰہی علم کا نتیجہ ہے کہ جادوگروں کو معجزہ سے آشنا کر دیا اور جاہلیت کے مارے ہوئے انسانوں کو علم کتاب و حکمت دے دیا۔

آپ کی محفل ایک مدرسۂ فکر و نظر تھی، جہاں صاحبان صلاحیت علوم و کمالات کے جواہر حاصل کر رہے تھے اور صبح و شام حقائق قرآن کا چرچا تھا۔ آپ کی زبان اقدس پر قرآن ہے تو سرچشمۂ کمالات اور حدیث ہے تو مصدر فضائل و کرامات —— اب یہ اپنے ظرف کی بات ہے کہ کسے کتنا حاصل ہوگا اور کون کس قدر فائدہ اٹھائے گا۔ نبیؐ کا دریائے فیض جاری ہے چاہے انسان مقداد بن جائیں یا ابولہب ابوذرؓ بن جائیں یا ابوجہل۔ معصوم کے کردار پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ باد بہاری سے گلاب بھی کھلتے ہیں اور کانٹے بھی۔ آب نیساں سے امرت بھی بنتا ہے اور زہر بھی۔ صاحب صلاحیت ہوتا ہے تو علم لے کے سلمان بن جاتا ہے، کم ظرف ہوتا ہے

تو مسلمان بھی نہیں ہوتا۔ صلوات،

سخاوت کو دیکھا جائے تو پوری پوری دولت خدیجہ سماج پر صرف ہوتی نظر آتی ہے۔ عرب کی تاریخ گواہ ہے کہ جناب خدیجہ عرب میں سب سے بڑی دولتمند خاتون تھیں۔ اور جب حضور سرورِ کائنات کے عقد میں آئی ہیں تو اپنی ساری دولت ہمراہ لے کر آئی ہیں، لیکن چند روز کے بعد خدیجہ کی بیٹی کو فاقے کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ دنیا بتائے کہ اتنی بڑی دولت کیا ہوئی اور اتنا عظیم خزانہ کہاں چلا گیا۔ یہ حضور سرورِ کائنات کی سخاوت اور آپ کا کرم ہی تھا کہ گھر میں فاقے ہو رہے تھے اور قوم کے فقیر غنی بن رہے تھے۔ صلوات،

شانِ تجارت یہ ہے کہ زندگی میں دو اہم سفر تجارت فرمائے۔ ایک مرتبہ کمسنی کے عالم میں اپنے چچا جناب ابوطالب کے ساتھ گئے تو عالم یہ تھا کہ راستہ کے عیسائی راہب نے دیکھ کر آواز دی کہ ابوطالب اس بچہ کو واپس لے جاؤ اور اسے شرِ دشمن سے بچاؤ۔ میں اس کے چہرہ میں نبوت و رسالت کے آثار دیکھ رہا ہوں اور عنقریب یہ کائنات کی عظیم ترین شخصیت ثابت ہوگا۔ اور دوسری مرتبہ جب جوانی کے عالم میں گئے تو اتنی برکت حاصل ہوئی کہ جب جناب خدیجہ کے غلام نے مالکہ کو راستہ کے کرامات کی اطلاع دی تو خدیجہ نے سماج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر عقد کا پیغام دے دیا اور ایک اپنے ہی مال سے تجارت کرنے والے عامل کے قدموں میں ساری دولت ڈال دی اور خود بھی اس کی خادمہ بن گئیں۔ اس کردار کا کوئی جواب ہے کہ انسان ایک سفر تجارت میں اتنی بڑی کائنات کا مالک ہو جائے اور ایک معاملہ تجارت سے زندگی کے بیشتر مسائل حل کر دے۔ اور مجھے تو جناب خدیجہ کے ظرف و کردار کی بھی تعریف کرنا پڑتی ہے کہ جہاں سماج میں اپنے سے

کمزور طبیعت کے انسان کو منھ لگانا عیب ہو وہاں اسی طبقہ کی ایک فرد کو اپنے مقدر کا مالک بنا دیا جائے، اور جہاں بڑے بڑے صنادید قریش کے پیغامات کو ٹھکرا دیا گیا ہو وہاں ایک یتیم عبداللہ کی کنیزی اختیار کر لی جائے۔

یاد رکھئے! غربت و افلاس کے عالم میں زوجیت کے سایہ میں پناہ لینا اور ہے اور دولت و سرمایہ کی آغوش میں شوہر کی پوری اُمت کو پناہ دینا اور ہے۔ صلوات،

عبادت کا عالم اور بھی حیرت انگیز اور تعجب خیز تھا۔ کہ رات رات بھر سجدہ اور دن بھر روزہ۔ قیام و قعود، رکوع و سجود، تلاوتِ قرآن۔ ذکر و فکر کے مشغلے۔ غارِ حرا کی منزل اور عبادتِ پروردگار۔ زندگی کے کارناموں کا آغاز ہی شانِ عبادت سے ہوتا ہے اور تاریخ کو کردار کا سراغ ہی غارِ حرا کے ذکر و فکر سے ملتا ہے اور معراجِ عبادت کا عالم یہ ہے کہ ساری کائنات سے بندگی کا مطالبہ کرنے والا پروردگار خود یہ کہتا ہے کہ میرے حبیب راتوں کو ذرا سو جایا کرو۔ بحکم خدا پر سجدوں کے لئے اٹھنا اور ہے اور بحکم خدا مصلیٰ چھوڑ کر آرام کرنا اور ہے۔ یہ شان یا نبیؐ میں دیکھی ہے یا علیؑ میں۔ کبھی بحکم خدا نبیؐ کو آرام کرتے ہوئے دیکھا ہے اور کبھی بحکم رسولؐ سے علیؑ کو بسترِ ہجرت پر سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ بحکم خدا ذرا دیر آرام کرے تو نبیؐ اور بحکم نبیؐ سے تمام رات چین سے سوئے تو علیؑ۔ صلوات۔

خدا کو بھی یہ شانِ عبادت اس قدر پسند آئی کو معراج کی رات عرشِ اعظم پر بھی بلایا تو محبت و نبوت کے نام پر نہیں۔ رسالت و سیادت کے نام پر نہیں، بلکہ ارشاد ہوا۔ سبحان الذی اسری بعبدہ یعنی یہ معراج، رسالت و نبوت

کی معراج نہیں ہے، عبدیت اور بندگی کی معراج ہے۔ صلوات۔

عبادت ہی کی طرح زہد و قناعت کا انداز بھی جداگانہ ہے۔ پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں اور تبلیغ اسلام ہو رہی ہے، گھر میں فاقے ہو رہے ہیں اور کارِ ہدایت انجام پا رہا ہے، دولتِ خدیجہ لُٹ رہی ہے اور اپنے لئے ایک ایک خرمہ کے عوض ایک ایک ڈول پانی کھینچا جا رہا ہے۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ زیرِ قدم کائنات ہو، زیرِ نگیں جنت اور بہارِ جنت ہو، زیرِ اثر جن و ملک ہوں اور گھر کی زندگی اتنی سادہ اور فقیرانہ ہو۔ یہ سب کیوں تھا؟ درحقیقت یہ حکمت کا ایک انداز تھا، کہ آج میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا ہوں۔ میرے اختیار میں ساری کائنات ہے لیکن کل میری امت کا کیا ہوگا اور پھر ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ نا فہم امت عیش و عشرت ہی کو مذہب و ملت کا نام دے دیگی اور یہ اندازہ بالکل صحیح نکلا کہ آج جب سیرتِ رسولؐ کی اتنی سادگی پیشِ نظر ہے تو درباروں پر ریشمی پردے پڑ گئے ہیں، اگر کہیں سرکار کی زندگی میں بھی رنگینی آ گئی ہوتی تو اسلام قیصریت و کسرویت کا دوسرا نام ہو جاتا اور دینِ الٰہی فنا کے گھاٹ اُتر جاتا۔ کوفہ اور شام کی زندگی میں یہی فرق ہے کہ کوفہ کا شہنشاہ حصیرِ مسجد پر بیٹھتا ہے اور شام کا حاکم فرشِ مخمل پر آرام کرتا ہے۔ اور کردارِ پیغمبر آواز دے رہا ہے کہ میرا جانشین "آسمان محلّ" نہیں ہوتا، "ابوتراب" ہوتا ہے۔ صلوات۔

ان حالات کو دیکھنے کے بعد جب سرکارِ دوعالمؐ کی شانِ شجاعت پر نظر جاتی ہے تو حیرت کی انتہا نہیں رہ جاتی، کہ ایک ایسا انسان جس کے دن محنت و مزدوری میں گزرتے ہوں، جس کی رات مصلّے پر گزرتی ہو، جس کے کام عبادت و ریاضت ہوں اور جس کی زندگی صرف زہد و قناعت ہو، اسے

میدانِ جنگ سے کیا واسطہ۔ لیکن یہ سرکارِ دو عالمؐ کے کردار کی ہمہ جہتی اور جامعیت تھی کہ آپ جہاں مصلّے پر عابدِ شب زندہ دار تھے وہاں میدانِ جہاد میں سردارِ لشکر ــــ جہاں بوریائے فقر پر ایک خاک نشین انسان تھے، وہاں محاذِ جنگ پر ایک قائدِ مہم آزما۔ آپ کی شجاعت کے تجزیہ کے لئے اسلام کے تمام معرکوں کا تجزیہ ضروری ہے اور اس کا محل و موقع نہیں ہے۔ اجمالی طور پر یہ کہنا کافی ہے کہ آپ محاذِ تبلیغ پر آئے تو پتھر برستے رہے لیکن اپنا راستہ نہیں بدلا، اور محاذِ جنگ پر آئے تو ثبات و استقلال کا مرقع بن گئے۔ آپ کا کوئی جہاد نہ اسلحہ کا ممنونِ کرم تھا نہ لشکر کا۔ جہاں لشکر کے قدم اکھڑ گئے ہوں وہاں آپ ثابت قدم رہے، اور جہاں سپاہیوں کے سر نہ اٹھتے تھے وہاں آپ میدانِ جنگ میں نظر آئے۔ سرکار کی شجاعت کا انداز دیکھنا ہے تو علیؑ سے پوچھئے، جس نے ہر میدان میں آخر تک ثابت قدم رہ کر شجاعت و استقلال کا مشاہدہ کیا ہے اور جب احد کے میدان میں حضورؐ نے کہا کہ یا علیؑ جب سب چلے گئے تو تم کیوں نہیں گئے؟ تو عرض کی، حضور میں آپ کے نقشِ قدم پر ہوں۔ جب تک آپ نہ چلے جائیں گے میں بھی نہ جاؤں گا۔ گویا اشارہ تھا کہ نبیؐ کی شجاعت کا اندازہ کرنا ہے تو میری شجاعت کو دیکھو، جب وصی کا ثباتِ قدم یہ ہے تو نبیؐ کا عالم کیا ہوگا اور شاید اسی لئے قدرت نے علیؑ کے ہاتھ میں ذوالفقار دے دی کہ علیؑ و نبیؐ کے مراتب کا فرق بھی محفوظ رہے اور دنیا دیکھ لے کہ تلوار کے جوہر دکھانے والا وصی ہوتا ہے اور تلوار کے بغیر میدانِ جہاد میں ثابت قدم رہنے والا نبیؐ۔ صلوات۔

ورنہ اس فرق سے قطعِ نظر کر لیا جائے تو علیؑ کی شجاعت و ہمت بھی تلوار کی ممنونِ کرم نہیں ہے۔ علیؑ نے روزِ اول ہی تلوار سے بے نیازی کا اعلان کر دیا تھا اور دنیا کو بتا دیا تھا کہ بدر و اُحد و خیبر و خندق میں میری تلوار کے جوہر

بعد میں دیکھنا، ہجرت کی رات میرا صبر وسکون پہلے دیکھ لو تا کہ اندازہ ہو جائے کہ تلوار پر بھروسہ کرنے والے اور ہوتے ہیں اور کردار پر بھروسہ کرنے والے اور۔ تلوار پر تکیہ کرنے والوں کی شان اور ہوتی ہے اور نصرت الٰہی پر اعتماد کرنے والوں کا انداز اور، صلوات،

کردار پیغمبرؐ کے انھیں پہلوؤں پر نظر کرنے کے بعد خاتمہ کلام میں سرکارؐ کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر کے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے کتنے مختصر وقت میں کیسے عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں، فرائض کا یہ عالم تھا کہ تلاوت قرآن بھی کرنا ہے اور تزکیہ نفوس بھی۔ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دینا ہے اور دین کے اصول بھی سکھانے ہیں۔ فروعی تعلیمات اور احکام شریعت بھی بتانا ہیں اور امت کی پرورش بھی کرنا ہے، گلیوں اور کوچوں میں توحید کی آواز بھی بلند کرنا ہے اور مریضوں کی عیادت بھی کرنا ہے۔ مرنے والوں کے جنازے بھی اٹھانا ہیں اور دیگر ملکوں میں اسلامی نمائندے بھی بھیجنا ہیں اور انھیں تبلیغی احکام و اصول کی بھی تعلیم دینا ہے، ازواج کے نفقہ کا بھی انتظام کرنا ہے اور بچوں کی تربیت کا بھی اہتمام کرنا ہے، اصحاب کی تعلیم و تدریس کا بھی اہتمام کرنا ہے اور سماج کے مشکلات میں بھی کام آنا ہے، لوگوں کی امانتوں کو رکھنا اور واپس بھی کرنا ہے، اور معاشرہ کے ہر اہم موقع پر حاضر بھی رہنا ہے، حج بیت اللہ کی قیادت بھی کرنا ہے اور میدانوں میں حاضری بھی دینا ہے۔ مسلمانوں کو جماعت بھی پڑھانا ہے اور تلاوت قرآن کے آداب بھی مقرر کرنا ہیں۔ خدیجہ کی بے پناہ تجارت و دولت کا انتظام بھی کرنا ہے اور ان تمام کاموں کے لئے وقت اتنا مختصر ہے کہ زندگی کے چالیس سال خاموش گزر گئے ہیں۔ ایک مدت غار حرا کی خاموش عبادت

جن گزری ہے، تین سال شعب ابوطالب میں محاصرہ کی مصیبت برداشت کی ہے، لگ بھگ اسّی لڑائیاں لڑی ہیں، متعدد سفیران مملکت سے روابط رکھے ہیں، جنگوں کے لئے لشکر تیار کیا ہے اور انھیں فنونِ جنگ تعلیم کئے ہیں۔ مباہلہ کے میدان کو سر کیا ہے۔ بچوں کے لئے ناقہ بنے ہیں۔ مسجد و کو خول دیا ہے، فدک کا بندوبست کیا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر بت شکنی کا انتظام کیا ہے، وطن چھوڑ کر ہجرت فرمائی ہے۔ انصار و مہاجرین کے درمیان مواخات و برادری قائم کی ہے۔ حدیبیہ میں صلح کی ہے، بیٹی کا عقد کیا ہے، نواسوں کی ناز برداری کی ہے، حاشیہ نشینوں کو عرب صحرائی سے خیرات بنایا ہے۔ آدمی کو انسان انسان کو مسلمان اور مسلمان کو مومن بنایا ہے، اتنے کارناموں کو اتنی مختصر ۲۳ سال کی تبلیغی مدت پر تقسیم کردیا جائے تو شاید ایک کام کے لئے ایک دن کا وقت بھی نہ ملے گا، لیکن یہ رسولؐ اسلام کی معجز نما زندگی تھی کہ اتنے ہی عرصہ میں سارا کام انجام دے دیا اور اس طرح انجام دے دیا کہ دوست تو دوست دشمن نے بھی کمال کردار کا اقرار کرلیا اور مسلمان تو مسلمان ہے خالق کائنات نے بھی میدان غدیر میں اعلان کردیا کہ آج میں نے دین کو کامل کردیا، اور نعمتوں کو تمام کردیا اور دین اسلام سے راضی ہوگیا۔ صلوات،

ان تمام باتوں کے بعد سب سے بڑا امتیازی کردار یہ ہے کہ کبھی اپنے کو رئیس اور حاکم کی شان سے نہیں پیش کیا، بلکہ امت کے ہر دکھ درد میں شریک رہے اور برابر کا برتاؤ کرتے رہے۔ آپ اس موقع کو یاد کریں کہ جب زندگی کے آخری لمحات تھے اور مرض الموت میں مسجد تک آکر آپ نے اعلان کیا کہ میں عنقریب دنیا سے جانے والا ہوں، اگر کسی کا کوئی حق میرے ذمہ ہو

تو لے لے، اور ایک شخص نے کھڑے ہو کر یہ دعویٰ کیا تھا کہ آپ ایک سفر میں جا رہے تھے اور آپ نے اپنے ناقہ کو تازیانہ مارنا چاہا تھا اور اتفاق سے وہ تازیانہ مجھے لگ گیا تھا، میں اس کا انتقام لینا چاہتا ہوں، تو آپ نے بلال کو بھیجا تھا کہ بلال سیدہؑ کے گھر سے تازیانہ لے آؤ۔ بلال نے دروازے پر آ کر آواز دی، شہزادی! آپ کے بابا نے تازیانہ طلب کیا ہے۔ شہزادی نے گھبرا کے کہا۔ بلال! بابا تو بیمار ہیں، ان میں تاب سفر نہیں ہے یہ تازیانہ کا کیا کام ہے؟ بلال نے عرض کی۔ بی بی! ایک شخص نے اپنے قصاص کا مطالبہ کیا ہے اور آپ کے بابا اس کا حق دینا چاہتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ زہراؑ کا دل تڑپ گیا۔ بلال یہ کون سا انسان ہے جسے بابا کی بیماری پر رحم نہیں آیا۔ میں کہوں گا۔ شہزادی! بیمار پر تازیانہ کا نام سنا اور دل بیقرار ہو گیا۔ کاش آپ کربلا کے میدان میں ہوتیں جہاں آپکا بیمار قید ہو کر کربلا سے شام تک تازیانوں پر تازیانے کھا تا جا رہا تھا۔

عزادارو! بلال تازیانہ لائے، پیغمبرؐ نے اس کے ہاتھ میں تازیانہ دیا، اس نے کہا، آپ پشت سے پیراہن ہٹا لیں۔ آپ نے پیراہن ہٹایا۔ اس نے بڑھ کر مہر نبوت کے بوسے لئے، میرے سرکار! خدا گواہ ہے کہ آپ کے ذمہ کسی کا کوئی حق نہیں ہے، یہ میری آخری تمنا تھی جسے پورا کرنے کے لئے میں نے یہ گستاخی کی تھی۔

دنیا جانتی ہے کہ رسولؐ کے ذمہ کسی شخص کا حق نہیں رہ سکتا۔ رسولؐ کسی کو تازیانہ نہیں مار سکتا، رسولؐ سے غلطی کا امکان نہیں ہے، لیکن آپ نے نہایت فراخدلی سے انتقام کا موقع دے کر دنیا کو دکھا دیا کہ میں دربار میں صحابی کو بھی نہیں جھٹلانا چاہتا۔ مگر اللہ رے انقلاب زمانہ، کہ ابھی

دربار میں جب رسولؐ کی بیٹی آتی ہے تو اس کی تکذیب کی جاتی ہے اور اسے صدمے پہنچائے جاتے ہیں، کیا فاطمہؑ کا یہ حق نہیں تھا کہ وہ فریاد کرتیں کہ بابا آپ کے بعد اتنے مصائب پڑے کہ دنوں پر پڑتے تو راتوں کی طرح سیاہ و تاریک ہو جاتے۔

وقت گزرتا رہا، زندگی کا آخری لمحہ آیا، ملک الموت نے دروازہ پر آکر آواز دی، سیدہؑ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، باپ کے رخسار پر آنسو گرے باپ نے آنکھیں کھول دیں۔ بیٹی خیر تو ہے یہ آنکھوں میں آنسو کیسے؟ عرض کی۔ بابا! کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں بار بار سمجھا رہی ہوں لیکن وہ برابر اصرار کر رہا ہے، فرمایا۔ سیدہؑ! اجازت دے دو، تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ ملک الموت ہے اور قبض روح کے لئے آیا ہے، بیٹی، یہ صرف تیرے در کا شرف ہے کہ ملک الموت بھی اجازت کے بغیر اندر نہیں آسکتا۔

عزادارو! جس زہراؑ نے آج اپنی ڈیوڑھی کا یہ شرف دیکھا ہے، اس نے دو دن کے بعد یہ انقلاب بھی دیکھا ہے کہ دروازے پر آگ اور لکڑیوں کا انبار ہے اور دھواں اٹھ رہا ہے۔ سیدہ فریاد کر رہی ہیں۔ جلتا ہوا دروازہ گرایا جاتا ہے، محسنؑ کی شہادت واقع ہوتی ہے، فاطمہؑ کا پہلو شکستہ ہوتا ہے، غشی کا عالم طاری ہوتا ہے، آنکھ کھلتی ہے تو وارث کے گلے میں رسی نظر آتی ہے۔ آواز دیتی ہیں۔ ظالمو! ابوالحسن کو چھوڑ دو، ورنہ میں اپنے سر کے بال پریشان کر دوں گی۔ میں کہوں گا، شہزادی ابھی آپ سر کے بال پریشان نہ کریں، ابھی تو فقط ایک دروازہ میں آگ لگی ہے، ابھی تو فقط ایک پہلو زخمی ہوا ہے، ابھی فقط ایک محسنؑ کی شہادت ہوئی ہے، ابھی

فقط ایک علیؑ کے گلے میں رسی باندھی گئی ہے۔ بی بی! سر کے بال پریشان کرنا ہیں تو اس وقت کیجئے گا جب عصرِ عاشور کا ہنگام ہوگا، سارے خیمے جل رہے ہوں گے، بیبیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمے کی طرف جا رہی ہوں گی، اور واغربتا! وامحمداؐ کے نعرے بلند ہوں گے، جب مقتل میں ہر طرف شہیدوں کے لاشے ہوں گے، شہزادیوں کی گود خالی ہو چکی ہوگی، رباب کا ششماہہ تیرِ سہ شعبہ کھا کر کربلا کی خاک پر سو گیا ہوگا۔

بی بی! سر کے بال کھولنا ہیں تو اس وقت کھولئے گا جب آپ کے حسینؑ کا گلا ہوگا اور شمر کا خنجر ہوگا، آپ کی زینبؑ فریاد کر رہی ہوگی اور زمینِ کربلا کو زلزلہ ہوگا۔ سیاہ آندھیاں چل رہی ہوں گی اور فضائے کربلا میں ایک آواز ہوگی اَلَاقُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَاذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا۔

بی بی! آپ کو بددعا کے لئے ہاتھ اٹھانا ہیں تو ابھی نہ اٹھائیے، یہ ہاتھ اس وقت اٹھائیے گا جب آپ کی زینبؑ کے ہاتھ بندھ جائیں، جب آپ کی امِ کلثومؑ قیدی بن جائے، جب آپ کی سکینہؑ شمر کے طمانچے کھائے، جب آپ کا عابدؑ بیمار ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوقِ خاردار پہنے اں بہنوں کے ساتھ کوفہ و شام کے بازار، تماشائیوں کے ہجوم میں سلطے ہوئے قافلہ کے ساتھ بلوائے عام میں جائے گا۔

بی بی! فریاد کرنا ہے تو اس وقت کیجئے گا جب شام کے زندان میں کمسن بچی دنیا سے سفر کر جائے اور آپ کی زینبؑ اپنی بےکس کا ماتم کرے، نہ کوئی غسل دینے والا ہو نہ کفن پہنانے والا۔ نہ کوئی جنازہ اٹھانے والا ہو نہ پُرسہ دینے والا اور فضائے شام میں ایک آواز گونج رہی ہو، بی بی! اٹھو تمہیں وطن جانے کی تمنا تھی، میری جان! قافلہ جا رہا ہے۔ بیٹی!۔ ماں تجھے چھوڑ کر کیسے جائیگی بی بی!

اور جیسے قبر سے آواز آ رہی ہوگی۔ قافلے والو! ــــ میرے چاہنے والوں سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا تمہاری مشتاق قید خانہ شام میں سو گئی اور اب پلٹ کر نہ آئے گی۔!

عزادارانِ مرسلِ اعظمؐ! وفاتِ سرورِ عالمؐ کا ذکر آگیا ہے تو ایک جملہ اور سن لیجئے۔

باپ کا وقتِ آخر تھا بیٹی سرہانے موجود تھی، بیٹی نے باپ کی آخری خدمت انجام دی کیا اس کے بعد بنی ہاشم کے جوانوں، باوفا اصحاب اور مولائے کائناتؑ نے مل کر نہایت اہتمام و احترام سے جنازہ دفن کر دیا۔ جی چاہتا ہے فریاد کروں صدیقہ طاہرہ۔ آپ اس بے قراری سے رو رہی ہیں جبکہ آپ نے باپ کی قبر دیکھی ہے، احترام سے جنازہ اٹھتا دیکھا ہے۔ میں اس بیٹی کے بارے میں کیا کہوں جو وقتِ آخر باپ کے سرہانے نہ آسکی اور جب شامِ غریباں کے سناٹے میں آئی تو ظالموں کے تازیانے کھائے اور پھر کربلا سے چلی تو جلتی ریتی پر باپ کا جنازہ چھوڑ کر ــــ اور پھر شام کے زندان میں یوں سو گئی کہ باپ کی قبر بھی نہ دیکھ سکی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مولائے کائنات حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

اسم مبارک	:	علیؑ، حیدر، ایلیا،
لقب	:	مرتضیٰ، امیرالمومنین وغیرہ
کنیت	:	ابوالحسن، ابوالائمہ،
والد ماجد	:	عمران (کنیت ابوطالب)
والدہ ماجدہ	:	فاطمہؑ بنت اسد،
ولادت	:	۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل، خانہ کعبہ، بروز جمعہ،
ازواج	:	جناب سیدہؑ، ام البنین وغیرہ
اولاد	:	امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینبؑ، جناب ام کلثوم، جناب عباسؑ، جناب محمد حنفیہؑ وغیرہ
شہادت	:	۲۱ رمضان المبارک یکشنبہ
عمر مبارک	:	۶۳ سال،
قبر مطہر	:	نجف اشرف

دوسری محفل داستانِ عظمتِ مولائے کائنات ؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انا علینا للھدیٰ وان لنا للاٰخرۃ والاولیٰ

ارشادِ جنابِ اقدسِ الٰہی ہو رہا ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اُوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مالکِ کائنات نے ہدایت بشر کا انتظام روزِ اوّل سے اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور تاریخ انسانیت میں کوئی دَور ایسا نہیں گزرا جب اس نے کوئی ہادی اور راہبر نہ مقرر کیا ہو، اور ہدایت انسانیت کا کوئی انتظام نہ کیا ہو۔ آغازِ تخلیق میں بشر سے پہلے ابو البشر کو راہنما بنا کے پیدا ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتی کہ دنیا گمراہوں کا وجود رہے اور راہنما کا وجود نہ رہے، ہدایت حاصل کرنے والے رہیں اور ہدایت دینے والا نہ رہے، اس نے یہ طے کر لیا ہے کہ جب تک کائنات میں کوئی ایک ہدایت لینے والا رہے گا، ہدایت دینے والا ضرور رہے گا چاہے پردۂ غیب ہی میں کیوں نہ رہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب اس نے آغازِ کائنات میں یہ برداشت نہ کیا تو انجام میں کیسے برداشت کرے گا بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تخلیقِ کائنات میں آدم کا سب سے پہلا راہنما بن کر پیدا

ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ راہنما، راہرو سے پہلے ہوتا ہے تو اب مجھے کہنا پڑے گا کہ جس طرح کل کوئی راہرو نہیں تھا لیکن راہنما تھا اس طرح کل کوئی راہرو نہ رہ جائے گا لیکن راہنما بہرحال قائم رہے گا۔ صلوات،

تخلیقِ آدمؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ راہنما کی خلقت میں ایک خصوصی اہتمام بھی برتا جاتا ہے جیسا کہ روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ قدرت نے خلقتِ آدم کیلئے خصوصیت کے ساتھ مٹی فراہم کرائی اور پھر مدتوں اسے خمیر کیا گیا۔ اور پھر پیکرِ آدمیت تیار کر کے اس میں اپنی روح پھونکی اور پھر ملائکہ سے سجدہ کرایا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ راہنما کی تخلیق میں ایک خصوصی اہتمام برتا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کل جب قدرت نے تخلیقِ آدم میں اتنا اہتمام برتا تھا تو پھر تخلیقِ نوحؑ و ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ میں یہ اہتمام کیوں نہیں برتا گیا۔ اور اگر برتا گیا تو اس کا تذکرہ دامنِ قرآن میں کیوں نہیں ہے۔؟

میرا خیال ہے کہ قدرت نے ہر نمائندہ کی خلقت میں کوئی نہ کوئی اہتمام ضرور برتا ہے، جیسا کہ تاریخ کے بعض واقعات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے لیکن تفصیلی تذکرہ صرف خلقتِ آدم میں اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان پہلی ہی منزل پر اس نکتہ کو پہچان لے، اس کے بعد تو خود ہی اندازہ کر لے گا کہ جب پہلے راہنما میں یہ غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے تو دوسرے راہنماؤں میں یہ اہتمام کیوں نظر انداز کیا جائے گا اور یہی انداز ہم نے ہر منزل پر دیکھا ہے۔ نبوت کے آغاز میں پہلے نبی کو اہتمام سے پیدا کر دیا تاکہ نبوت کی انفرادیت کا اندازہ ہو جائے اور امامت کی منزل میں پہلے امام کو بڑے اہتمام سے خلق کر دیا گیا

امامت کی جلالت کا اندازہ ہو جائے۔ صلوات۔

نبی سب نبی ہیں اور امام سب امام ہیں، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ نہ نبوت کی منزل میں آدمؑ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرایا گیا اور نہ امامت کی منزل میں علیؑ کے علاوہ کوئی خانۂ کعبہ میں پیدا ہوا۔ وہ تاریخ نبوت میں آدمؑ کا امتیاز تھا اور یہ تاریخ امامت میں علیؑ کا امتیاز ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح آدمؑ خلیفۃ الناس نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے اس طرح علیؑ خلیفۃ المسلمین نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے۔ علیؑ کا درجہ معین کرنا ہے تو آدمؑ سے سلسلہ شروع کرو، علیؑ کے سلسلہ میں کوئی دوسرا البشر نہیں آ سکتا اور یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات نے خود اعلان فرما دیا تھا کہ میں چوتھا خلیفہ ہوں اور جب چاہنے والوں نے حیرت سے پوچھا مولا! یہ کیا فرما رہے ہیں، ہم تو آپ کو خلیفہ بلا فصل اور پہلا امام مانتے ہیں تو فرمایا۔ بے شک میں چوتھا خلیفہ ہوں۔ عرض کی۔ مولا! جلدی وضاحت فرمائیں، آپ کا مقصد کیا ہے؟۔ فرمایا!۔ اللہ نے قرآن حکیم میں چند خلافتوں کا تذکرہ کیا ہے، سب سے پہلے اس نے آدمؑ کو خلیفہ بنایا، اس کے بعد داؤدؑ کی خلافت کا اعلان کیا، اس کے بعد ہارونؑ کو خلیفہ بنایا اور آخر میں مجھے خلیفہ قرار دیا، تو میں ان تینوں خلفاء الٰہی کا چوتھا خلیفہ ہوں۔ صلوات۔

مولائے کائنات نے اس تفصیل سے دو باتوں کو واضح کر دیا۔ اوّل تو یہ میرا سلسلہ الٰہی خلفاء سے ہے، مسلمانوں کے خلفاء سے نہیں، مجھے ان سے نہ ملانا اور میری منزل کا تعین کرنے کے لئے ان کا سہارا نہ لینا، یہ ظالم ہیں، میں معصوم یہ جاہل ہیں میں عالم، یہ گنہگار ہیں میں پاکیزہ کردار، یہ بت پرست ہیں میں بت شکن، یہ مشرکین کے گھروں کے پیدا ہیں اور میں خانۂ کبریا۔

یہ آغاز میں ظلمت تھے اور انجام میں مادیت اور میں آغاز میں نور کامل تھا اور انجام میں نورِ مجسم، ان کی خلقت مادہ سے ہے، میری خلقت نور سے ہے، ان کی خلقت جہالت کے ساتھ ہوئی ہے میری تخلیق تلاوتِ قرآن کے ساتھ۔ ان کی خلقت مشرک عورتوں کے ہجوم میں ہوئی ہے میری خلقت حورانِ جنت کے حضور میں ___ انھیں دنیا نے اپنا نمائندہ بنایا ہے مجھے اللہ نے اپنا جانشین بنایا ہے، انھیں امت کی ادار نے صاحبِ اقتدار بنایا ہے مجھے الٰہی کرم نے جنت و جہنم کا مختار بنایا ہے، انھیں دنیا کے خزانوں نے غنی بنایا ہے مجھے الٰہی دولت نے امیر بنایا ہے، انھیں بندوں کے مفادات نے القاب و خطابات عطا کئے ہیں میری شان میں عرشِ الٰہی سے آیتیں اتری ہیں اور مختصر یہ ہے کہ انھوں نے تاجِ شاہی کو زینتِ سر بنایا ہے اور میں نے تاجِ حکومت کو ٹھوکروں میں رکھا ہے۔ صلوات،

دوسری طرف مولائے کائناتؑ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ قرآن مجید میں جس خلافت کا ذکر ہے وہ انبیاءؑ کی خلافت ہے اہلِ دنیا کی خلافت نہیں ہے۔ اس نے یا تو آدمؑ و داؤدؑ و ہارونؑ کی خلافت کا ذکر کیا ہے یا آیتِ ولایت میں میری حکومت کا تذکرہ کیا ہے ___ یا انبیاء و مرسلین کی جانشینی کا تذکرہ کیا ہے یا میدانِ غدیر میں میری عظمت کا اعلان کیا ہے۔ پہلے خلیفہ سے دین کا آغاز کیا ہے یا آخری خلیفہ پر دین کی تکمیل کی سند دی ہے اس کے علاوہ اس کے دامن میں کسی خلافت کی گنجائش نہیں ہے،

میں عظمتوں کی بحث میں نہیں جانا چاہتا، میں اگر یہ تسلیم بھی کرلوں کہ سلاطین دنیا کے فضائل و مناقب میں بھی آیتیں نازل ہوئی ہیں اور قرآن حکیم نے انھیں بھی اپنا ممدوح قرار دیا ہے تو بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ قرآنِ حکیم نے ان کی خلافت و حکومت کا کوئی تذکرہ کیا ہے۔ اور تذکرہ کیا، بحمد اللہ چاہنے والوں نے آج تک

دعویٰ بھی نہیں کیا۔ تو اب مجھے کہنا پڑے گا کہ جس خلافت و امامت و حکومت و ولایت کا ذکر قرآن میں ہے وہ علیؑ کا حصہ ہے اور جس کا تذکرہ تاریخ میں ہے وہ سلاطین دنیا اور شاہانِ وقت کا حصہ ہے۔ اب امت کو اختیار ہے چاہے خلافتِ قرآن پر ایمان لائے یا خلافتِ تاریخ پر اور جب اس کا فیصلہ ہو جائے گا تب میں دیکھوں گا کہ حسبنا کتاب اللہ کے دعویٰ میں کتنا اثر ہے اور مجھے یہ کہنے کا حق ہوگا کہ حسبنا کتاب اللہ کا دعویٰ ہم کرتے تو زیب بھی دیتا، یہ تاریخ کے پرستاروں کو حسبنا کا دعویٰ کرنے کا حق کہاں سے پیدا ہو گیا۔ لیکن ہم نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ اس لئے کہ خود قرآن ہی نے اپنے مفسروں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اور رسولِ اعظم بھی تنہا قرآن کو چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ آپ نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک قرآن اور ایک میری عترتؑ اور میرے اہل بیتؑ،

اب تو یہ واضح ہو گیا کہ تنہا قرآن پر ایمان لانے والا نہ خدا کا وفادار ہے نہ پیغمبر کا، اس کا ایمان نہ توحید پر ہے نہ رسالت پر، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کے نعروں کی کوئی قیمت نہیں ہے، جب تک "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ" پر ایمان نہ ہوگا، نہ لا الٰہ الا اللہ کام آئے گا نہ محمد رسول اللہ صلوات۔

عزیزانِ محترم! مجھے آج اسی سلسلہ خلافت انبیاء کی چوتھی اور سلسلۂ امامت کبریٰ کی پہلی کڑی کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ قدرت نے اس کی ولادت میں کیا اہتمام برتا ہے۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب مولائے کائنات کی ولادت کا وقت

قریب آیا تو جناب فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ کے قریب آئیں اور اپنے شکم اقدس کو دیوارِ کعبہ سے مس کر کے دعا کی۔ اے پروردگارا میں تجھ پر ایمان لائی، تیری کتابوں پر ایمان لائی، تیرے رسولوں پر ایمان لائی، معبودا! اس بیت کا واسطہ، اس کے معمار ابراہیمؑ کا واسطہ اور اے میرے پروردگار اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے، میری مشکل کو آسان کر دے۔ راوی کہتا ہے کہ ابھی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ دیوارِ خانۂ کعبہ شق ہوئی اور نیا در پیدا ہوا، جناب فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ کے اندر گئیں اور مولائے کائنات کی ولادت ہوئی، تین روز خانۂ کعبہ میں مقیم رہیں، دیوار اپنی اصلی حالت پر پلٹ گئی، لوگوں کو واقعہ کی خبر ہوئی تو چاروں طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے۔ یہ کیا قیامت ہوئی، یہ دیوار کیوں کر شق ہوئی، یہ دوبارہ کس طرح جڑ گئی، یہ فاطمہؑ بنت اسد ڈریں کیوں نہیں، اور کس طرح اندر چلی گئیں، اور چلی گئیں تو اب باہر کیوں نہیں آتیں؟

دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی، لوہار بلائے گئے، قفل توڑنے کی سعی ہوئی لیکن قفل کو نہیں ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا، دروازہ کو نہیں کھلنا تھا نہ کھلا، تین دن کے بعد از خود دیوار میں در پیدا ہوا، اور فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ سے باہر آئیں، پیغمبر اسلامؐ استقبال کے لئے بڑھے، بچہ کو چچی کی آغوش سے اپنی آغوش میں لیا، بچہ کی آنکھیں بند تھیں، جیسے ہی نبیؐ کی آغوش میں آیا، آنکھیں کھول دیں، اور جمالِ رسالت پر نظر ڈالی، پیغمبرؐ نے فرطِ مسرت سے اعلان کیا۔ یا علیؑ! تو نے اپنی نظر کے لئے مجھے مخصوص کیا اور میں نے اپنے علم کے لئے تجھے مخصوص کیا۔ صلوات،

عزیزانِ گرامی! واقعہ کی تفصیلات آپ کی نگاہ کے سامنے ہیں، غور کیجئے تو ہر لفظ ایک فضیلت اور ہر لمحہ ایک کرامت ہے، ہر منزل ایک شرف ہے، اور ہر قدم ایک جلالت۔

زیادہ تفصیل کا محل نہیں ہے، صرف چند لفظوں کی طرف آپ کے ذہن کو متوجہ کردینا چاہتا ہوں، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب بنت اسد کو ولادت کی تکلیف کا سامنا ہوا تو گھر سے باہر کیوں نکلیں، ایسے موقع پر خواتین اپنے گھر میں رہا کرتی ہیں اور دوسری عورتیں دعاء کے لئے مسجد اور عبادت گاہوں کی طرف جایا کرتی ہیں لیکن یہاں فاطمہ بنت اسد نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا، اور خانۂ کعبہ تک چلی آئیں، اور پھر آئیں بھی تو ایسی پریشان نہیں کہ گھبرا کر اپنا مدعا بیان کردیتیں، بلکہ پہلے اپنے ایمان کا اعلان کیا، پھر اپنے مولود کی جلالت کا واسطہ دیا اور آخر میں دعا کی، دعاء کے بعد بھی دیوار کعبہ شق ہوئی تو پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ گئیں ــــ آج اگر خدانخواستہ اسی عمارت کی کوئی دیوار ٹوٹنے لگے تو آپ حضرات بھی یہاں نظر نہ آئیں گے، چہ جائیکہ ایک خاتون اور وہ بھی ایسے سخت وقت میں جب کہ عورتیں سایہ سے بھی ڈرا کرتی ہیں اور پرچھائیوں سے بھی دہشت زدہ ہو جاتی ہیں جناب فاطمہ بنت اسد پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ جاتی ہیں اور خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہو جاتی ہیں، اس کے بعد یہ خیال بھی نہیں ہے کہ وہاں کون مددگار ملے گا، کہاں سے عورتیں آئیں گی، کون اس موقع پر ساتھ دے گا، کہاں سے آب و دانہ کا انتظام ہوگا، کہاں سے آنے والے فرزند کے ضروریات فراہم ہوں گے۔ اور اس کے بعد قیامت یہ ہے کہ منظر کو دیکھ کر سارے شہر میں کہرام برپا ہے، تمام افراد سمٹ کر خانۂ کعبہ کے قریب آگئے ہیں اور تین دن گزرنے پر بھی جناب

ابطالب نہیں آئے، جنھیں آنا چاہئے تھا، اور جن کی یہ ذمہ داری تھی، آج اگر ایسے موقع پر کوئی خاتون گھر سے باہر چلی جائے تو سب سے زیادہ فکر شوہر کو ہوگی، اور پھر ایسے ماحول میں جبکہ گھر کا دروازہ بند ہو اور کمک تک پہونچانا ممکن نہ ہو، کیا ابوطالبؑ کو اپنے آنے والے لال کی فکر نہیں ہے، کیا فاطمہؑ بنت اسد کی زحمتوں کا خیال نہیں ہے، کیا انھیں مکہ کے ہنگامہ کی خبر نہیں ہے، کیا ان سے لوگوں نے اس عجیب و غریب حادثہ کو نہیں بیان کیا۔ یقیناً یہ سب کچھ ہوا، تو پھر سوال یہ ہے کہ ابوطالبؑ کیوں نہیں آئے؛ اور قیامت یہ ہے کہ تین دن کے بعد بھی پیغمبر اسلامؐ آئے ابوطالبؑ نہیں آئے۔

عزیزانِ گرامی! واقعہ کے خصوصیات صاف اعلان کر رہے ہیں کہ یہ ولادت کسی عام بچہ کی ولادت نہیں ہے، اس میں قدرت نے ایک خصوصی اہتمام برتا ہے، اور اس کا اندازہ دنیا کے دوسرے افراد کی ولادت سے بالکل جداگانہ ہے، جبھی تو دیواریں در بنا کے بلایا گیا ہے۔ اور بچہ بھی کیسا بچہ کہ تین دن گزر گئے آنکھ ہی نہیں کھولتا۔ ماں فطری اعتبار سے پریشان ہے، خدا نخواستہ کیا وجہ ہے کہ بچہ آنکھ نہیں کھولتا اور بچہ ہے کہ آنکھ بند کئے ہوئے ہے اور تین دن کے بعد جیسے ہی آغوش پیغمبرؐ میں آتا ہے فوراً آنکھیں کھول دیتا ہے۔ یہ کس نے بتایا کہ کس کی آغوش سے کس کی آغوش میں آگیا، یہ کیسے معلوم ہوا کہ خانۂ کعبہ سے باہر آچکا ہے، یہ کیسے اندازہ ہوا کہ یہ ماں کی آغوش نہیں ہے، رسالت کی آغوش ہے، اور یہ کس نے سکھایا کہ خانۂ کعبہ کے اندر آنکھ نہیں کھولنا چاہئے آغوش پیغمبرؐ میں آکر آنکھ کھولنا چاہئے، کیا بچے کو ماں سے زیادہ کسی سے انس ہے اور اگر ایسا ہے تو ماں بچہ کی حکایت

کمل نہیں کرتی اور یہ کیوں نہیں کہتی کہ تیرا چھوٹا بھتیجا (معاذاللہ) ایک نقص لے کر آیا ہے کہ اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور پھر نبوت کو کیا ہو گیا ہے کہ جب برنبائے فطرت بچہ آنکھ کھولتا ہے اور جو چہرہ سامنے ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے تو نبوت کو یہ ادا اس قدر پسند آجاتی ہے کہ اتنی ہی سی بات پر سارے علم کا فیصلہ کر دیتا ہے اور نظر سے علم کا سودا ہو جاتا ہے۔

ارباب کرم! شعراء کے یہاں نظر سے سیراب ہونا تو دیکھا تھا لیکن نظر سے کمالات کا منتقل ہونا نہیں دیکھا تھا، یہ آج دیکھ رہا ہوں کہ آنے والے بچہ نے ایک نظر میں سارے کمالات کا سودا کر لیا، یہ بچہ بھی عجیب بچہ ہے کہ بچپنے میں چہرۂ رسالت پر ایک نگاہ ڈالتا ہے تو علم رسالت کا سودا کر لیتا ہے اور جوانی میں بستر رسالت پر ایک نیند سو جاتا ہے تو مرضی پروردگار کا سودا کر لیتا ہے۔ صلوات،

تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے، واقعہ کے خصوصیات نگاہ میں آگئے ہیں اب اس کے سوا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ خدا اور رسولؐ کا ایک جانا پہچانا منصوبہ تھا، جس کی رازدار جناب فاطمہؑ بنت اسد بھی تھیں اور جناب ابوطالبؑ بھی، اور بزرگوں پر اضطراب طاری نہ ہونا بھی اسی بنیاد پر تھا کہ سب کو رازِ الٰہی کی خبر تھی اور سب کو معلوم تھا کہ آج قدرت کا یہی اہتمام ہے اور واقعات کو اسی انداز میں پیش آنا ہے اور اگر الگ الگ تفصیلات دریافت کرنا چاہتے ہیں تو مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جناب فاطمہؑ بنت اسد گھر سے نکل کر خانۂ کعبہ تک اس لئے آئیں کہ آج کا مولود میرا نمائندہ نہیں ہے، پروردگار کا نمائندہ ہے، دعا سے پہلے ایمان کا اعلان اس لئے کیا کہ نا فہم امت میرے

ایمان کا اندازہ کرلے اور کل بحث ایمان میں باپ کی طرح ماں کا ایمان بھی جھگڑے میں نہ پڑجائے، اور جب میرا ایمان ثابت ہوجائے گا تو دُنیائے عقل و ہوش کو سوچنا پڑے گا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے مسلمان عورت کسی کافر مرد کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی اور اس طرح سے کر خیمہ میرے ایمان کا بھی اعلان ہو جائے گا۔ صلوات،

دُعاء میں انبیأ اور کتب کا حوالہ دے کر اپنے ایمان کی وسعت اور اپنے معلومات کی بلندی کا اعلان کیا اور معمارِ حرم کا حوالہ دے کر واضح کردیا کہ خانۂ کعبہ کے گرد بھی وسیلہ کے بغیر دعاء قبول نہیں ہوتی، اب وہ لوگ خانۂ خدا سے کیا لے جائیں گے جو وسیلہ کے قائل نہیں ہیں اور خدا تک بلا وسیلہ پہنچنا چاہتے ہیں۔

مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ براہِ راست جانے والے براہِ راست ہی جائیں گے، اب کہاں جائیں گے اس کا فیصلہ روزِ قیامت ہوگا، اور اگر آج چاہتے ہیں تو اس حدیث کو پڑھ لیجئے جس میں مسلمان نے اپنے خدا کو بھی جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ اور یہ اعلان کردیا ہے کہ جب جہنم کا پیٹ نہیں بھرے گا تو معاذاللہ خدا بھی اپنا ایک پیر جہنم میں ڈال دے گا۔

عزیزو! معمارِ جنت کو اپنا وسیلہ بناؤ تاکہ جنت تک جانے کا راستہ ملے، ورنہ براہِ راست وہیں جانا پڑے گا جہاں پہلے سے معاذاللہ اپنے خدا کو بھیج دیا ہے۔

معمارِ حرم کا واسطہ دینے کے بعد اپنے مولود فرزند کا واسطہ دیا تاکہ دنیا پہچان لے کہ میرا لال دنیا میں آنے کے بعد ہی مشکل کشا نہیں ہے، عالمِ انوار ہی سے

مشکل کشائی کر رہا ہے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ علیؑ کو چھوڑنے کے بعد ابراہیمؑ کا واسطہ بھی نامکمل رہ جاتا ہے اور خانۂ خدا کا قرب بھی بے کار ہو جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو اہلبیتؑ کو چھوڑ کر بیت سے کچھ بھی ہاتھ آئے گا طواف نہ ملے گا، طواف کرنا ہے تو اہلبیتؑ کو بھی پہچاننا پڑے گا، اور ان پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔ صلوات،

دیوار کے شگافتہ ہونے پر پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ کر واضح کر دیا کہ فرار کرتی اگر کسی فرار کی ماں ہوتی لیکن مجھے پہچانو! میں حیدرؑ کرار کی ماں ہوں اور مجھے یہ دیوار کیا مرعوب کرے گی، میرا ہر رشتہ شجاعت کا ضامن اور ہمت و استقلال کا ذمہ دار ہے۔ میں ایک اسد کی بیٹی ہوں اور ایک شیر ذوالجلال کی ماں، میرے میدان سے ہٹنے کا کیا سوال ہے۔ صلوات،

آئیں تو اس بے نیازی سے آئیں کہ نہ ہمدردوں کا خیال ہے نہ عورتوں کا انتظار، نہ آب و دانہ کی فکر ہے نہ انتظاماتِ ولادت کی کشمکش، اور زبانِ حال سے آواز دے رہی ہیں کہ یہ سب فکریں ہوتیں اگر میں خود سے آتی، لیکن جب کسی کے بلانے پر آئی ہوں تو اب انتظام اسی کے ذمہ ہے، میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مجھے اس کے کرم پر اعتماد ہے کہ وہ کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا اور اگر کسی دنیا والے کی آمد ہوتی تو مکہ کی عورتوں کو طلب کرتی لیکن جب اُدھر والے کی آمد کا مسئلہ ہے تو خدمت کے لئے بھی اُدھر ہی کی عورتیں آئیں گی۔ چنانچہ روایت گواہ ہے کہ حوّا آئیں، سارہ آئیں، مریم آئیں، حورانِ جنت آئیں اور فاطمہؑ بنت اسد کے مشکلات میں کام آئیں اور قدرت نے اعلان کر دیا کہ اب فرقِ مراتب پہچان لو! جو مریم وقتِ ولادت خدمت کے لئے آئیں ان کا مرتبہ بنتِ اسد کا مرتبہ نہیں ہو سکتا، اور ان کا لال فاطمہؑ کے لال کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے

کہ اسے دنیا نے بھی محسوس کیا اور اللہ نے بھی ثابت کر دیا۔ دنیا نے یوں محسوس کیا کہ مریم کے لال کو اللہ کا بیٹا کہا اور بنت اسد کے لال کو خدا مانا۔ اور خدا نے یوں محسوس کرایا کہ امامت کی آخری منزل پر مریم کے لال کو ماموم بنا دیا اور بنت اسد کے آخری فرزند کو امام بنا دیا، صلوات،

اور شاید قدرت کے اسی منصوبہ کی کارفرمائی تھی کہ دنیا پریشان ہو کر خانۂ کعبہ کے قریب آئی لیکن جناب ابوطالبؑ نہیں آئے۔ ابوطالبؑ آواز دے رہے تھے کہ فاطمہؑ خود سے گئی ہیں تو میں تلاش میں نکلتا اور علیؑ میرے نمائندہ ہوتے تو انتظامات کی ذمہ داری میرے اوپر ہوتی لیکن جب خدا نے بلایا ہے اور آنے والا بھی اسی کا نمائندہ ہے تو ذمہ داری کا بار بھی اسی کے سر ہے۔ طالب و جعفر و عقیل کا انتظام میں نے کیا ہے اور علیؑ کا انتظام پروردگار کے ذمہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب حالات کی پریشانی کی بنا پر ابوطالبؑ کے فرزندوں کی کفالت کا موقع آیا اور یہ طے پایا کہ ایک ایک بچہ کو لے کر پال لیا جائے، اور ابوطالبؑ کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے تو علیؑ بن ابی طالب کو پیغمبرؐ ہی لائے کہ دنیا پہچان لے کہ جن کی تربیت دنیا والوں کے ذمہ تھی انھیں دنیا والے لے گئے اور جس کی پرورش مالکِ کائنات کے ذمہ تھی اس کی ذمہ داری رسولؐ اسلام نے لے لی ہے۔ نعرۂ صلوات،

عزیزانِ محترم! علیؑ آغوشِ پیغمبرؐ سے دوبارہ ماں کی گود میں آئے ماں نے دستورِ عرب کے مطابق حفاظت کی غرض سے بچہ کو کپڑے میں لپیٹنا چاہا بچہ نے کپڑے کو پارہ پارہ کر دیا، دوسرے کپڑے میں لپیٹا، اس کا بھی یہی حشر ہوا سات پارچہ استعمال کئے اور بچہ نے سب کو پارہ پارہ کر دیا، اور ایک مرتبہ

آواز دی۔ "یا اُمّاہ دَعِینی اُسَبِّح" مادرِ گرامی! مجھے چھوڑ دیجئے۔ مجھے تسبیح کرنے دیجئے۔
میں کہوں گا یا علیؑ تسبیح پروردگار کو ہاتھ سے کیا تعلق، ہاں زبان کو حرکت کرنے
دیجئے۔ آپ تسبیح پڑھنا چاہتے ہیں پڑھئے۔ تسبیح کو اس مسئلہ سے کیا تعلق ہے؟
امام کی مصلحت، امام ہی جانتا ہے۔ لیکن واقعہ کو دیکھو کہ ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ علیؑ منزلِ تسبیح میں ہاتھ کا بندھنا پسند نہیں کرتے۔ جبھی تو بار بار کہہ رہے
ہیں مادرِ گرامی میرے ہاتھ کھول دیجئے میں تسبیحِ پروردگار کرنا چاہتا ہوں! پہچانا
آپ نے۔ جو نکتہ دنیا آخر تک نہ سمجھ سکی امامت نے اسے بچپنے ہی میں سمجھا دیا اور
بتا دیا کہ تسبیحِ پروردگار میں کون سا انداز محبوبِ کردگار ہے۔ صلوات۔
آخر کار مادرِ گرامی نے بچہ کو گہوارہ میں لٹا دیا اور کسی کام سے چلی گئیں
دھر ایک اژدہا آیا اور گہوارہ کی طرف بڑھا۔ چاہتا تھا کہ مولودِ حرم پر حملہ کرے
کہ ایک مرتبہ بچے نے گہوارے سے دونوں ہاتھ نکالے اور اژدہے کو
دو ٹکڑے کر کے خاک پر ڈال دیا۔ صلوات۔
دنیا انگشت بدنداں تھی کہ یہ کم سنی اور یہ ہمت، یہ گہوارہ اور یہ
بہادری۔ لیکن علیؑ نے واضح کر دیا کہ جس کی طاقت دنیا کی دین ہوتی ہے وہ
مشق و مہارت کے بعد شجاعت کا مظاہرہ کرتا ہے اور جس کی طاقت خدا داد ہوتی ہے
وہ ایسے ہی کرامات کا اظہار کرتا ہے۔
اللہ رے کمالِ علیؑ — آغوشِ رسولؐ میں آئے تو آسمانی صحیفوں کی تلاوت
کر دی، گہوارہ میں آئے تو اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیئے اور قرآن مجید نے
آواز دی کہ ہم نے طالوت کو اس لئے سردارِ لشکر بنا دیا تھا کہ ان کے پاس
علم کی طاقت بھی تھی اور جسم کی قوت بھی۔ ہم مال و دولت اور جاہ و حشم نہیں

دیکھا کرتے۔ ہماری نمائندگی کے لئے علم و جسم کی درستی درکار ہوتی ہے، علیؑ نے آواز دی۔ دنیا والو! اگر میری نمائندگی کی شان پہچاننا ہے تو مجھے جوانی اور ضعیفی میں نہ دیکھو، میری کم سنی کا عالم دیکھو۔ خانۂ کعبہ سے نکل کر آغوش نبیؐ میں آیا تو علم کا اعلان کیا، اور گہوارہ میں قدم رکھا تو طاقتِ جسم کا اظہار کر دیا۔ اب میرے علاوہ اس کائنات میں کون نمائندہ پروردگار ہو سکتا ہے۔ ؛ صلوات۔

واقعہ تمام ہو گیا، لیکن علیؑ کے اظہار شجاعت سے عالم عربیت میں ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا، جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے کہ اس اژدہے کا خاصہ یہ تھا کہ اسے معیار الولد کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور عرب میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو لوگ اسے اژدہے کے قریب لاکر ڈال دیا کرتے تھے، اگر اس کے نسب میں کوئی عیب ہوتا تو اژدہا اسے فنا کر دیتا تھا اور اس طرح زندگی سے نجابت و شرافت کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ علیؑ نے اژدہے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تو لوگ گھبرا کر پیغمبر اسلام کے پاس آئے، حضور اب کیا ہوگا؟ اس بچہ نے تو قیامت ہی ڈھا دی، اب ہمارے بچوں کا کیا حشر ہوگا اور ہم نجابت کا فیصلہ کیسے کریں گے؟

مرسل اعظمؐ نے فرمایا۔ تمھیں تو اس واقعہ پر خوش ہونا چاہئے کہ اگر یہی سانپ معیار بنا رہ جاتا تو اس کے مرنے کے بعد پھر کوئی معیار نہ رہ جاتا۔ یہ قدرت کا کرم تھا کہ اس نے فانی معیار کو ہٹا کر ایک ابدی اور دائمی معیار دے دیا، یاد رکھو آج سے نسب کا معیار یہ علیؑ کی محبت ہے، اس کی محبت کو دیکھتے جانا اور نجابت و شرافت کا فیصلہ کرتے رہنا۔ صلوات،

بات آخری منزل تک لا رہا ہوں، اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، علامہ سعید اللہ امرتسری نے اپنی کتاب "ارجح المطالب" میں علیؑ کے ناموں میں حیدرؑ کی بھی وجہ بیان کی ہے کہ علیؑ نے اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یہ وجہ صحیح ہو یا نہ ہو، اتنا ضرور ہے کہ اس نام کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ ضرور وابستہ تھا کہ لوگ اس نام سے لرزتے تھے، چنانچہ جب خیبر کے میدان میں آپ نے مرحب سے کہا کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے تو اس نے گھبرا کر واپسی کا ارادہ کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ اب سر کی خیر نہیں، لیکن خدا بُرا کرے ابلیس ملعون کا کہ یہ اپنوں کا بھی نہیں ہوتا، کہنے لگا کہ مرحب کہاں واپس جارہا ہے لوگ تیرے بارے میں کیا کہیں گے۔ تیری شجاعت کس قدر رسوا ہوگی۔ اس نے کہا کہ میری ماں نے وصیت کی ہے کہ حیدرؑ نامی پہلوان سے نہ لڑنا ورنہ زندگی کی خیر نہیں۔ ابلیس نے کہا، مرحب! کیا ایک نام کے بہت سے انسان نہیں ہوتے؟ یہ کیا ضروری ہے کہ یہ وہی حیدرؑ ہوں جن کے بارے میں تیری ماں نے وصیت کی ہے۔؟ شامت کا مارا پلٹ کر آیا اور جو انجام ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے! لیکن عزیزانِ گرامی! یہ معلوم ہو گیا کہ شیطان کا ایک حربہ یہ بھی ہے کہ ایک نام کے بہت سے کہہ کر فضائل پر پردہ ڈال دیا کرتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے مقامِ فضیلت میں اہلبیتؑ کے کردار کا ذکر کیا ہے، نام نہیں لیا، کہ یہ ابلیس کے پیرو وہاں بھی یہی نسخہ استعمال کریں گے۔ پیغمبر اسلامؐ نے بھی اسی فطرت کا اندازہ کر کے میدانِ غدیر میں علیؑ کو مولا نہیں بنایا، بلکہ فرمایا "یہ علی مولا ہے"۔ تاکہ ایک نام کے بہت سے نہ ہو جائیں۔ صلوات،

فضائل کو اس منزل پر لانے کے بعد ایک نظر ان آخرنوں پر بھی

ڈالنا ضروری ہے جن سے فضائلِ اہلبیتؑ کسی صورت سے برداشت نہیں ہوتے اور بر بنائے فضیلت پر کوئی نہ کوئی نقص نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب عام فضائل میں یہ روش ہے جہاں مقابلہ کرنے کی بھی گنجائش ہے اور دوبارہ حاصل کرنے کی بھی گنجائش ہے تو اس فضیلت کا کیا عالم ہوگا جس میں مقابلہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ کوئی انسان دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے، نہ علیؑ کی اس فضیلت سے مقابلہ ہو سکتا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان آواگون کا بھی قائل نہیں ہے کہ اس امید میں زندگی گزار لیتا کہ شاید اگلے جنم میں خانۂ کعبہ میں پیدا ہو جائے، چنانچہ چاروں طرف سے مایوس ہونے کے بعد آخری راستہ یہ نکالا کہ مولا کی اس فضیلت ہی سے انکار کر دیا جائے، فضیلت سے انکار کے دو راستے نکالے گئے، ایک راستہ یہ ہے کہ خانۂ خدا میں پیدا ہونا کوئی علیؑ کا کمال نہیں ہے۔ یہ تو انسان کا غیر اختیاری عمل ہے۔ جس میں اس کا کوئی بس نہیں ہے، انسان نہ پیدائش پر اختیار رکھتا ہے، نہ موت پر، کب کہاں موت آ جائے کس کے بس کی بات ہے اور کہاں پیدا ہو جائے کس کے اختیار کی بات ہے۔ یہ مالکِ کائنات کے اختیار کی بات ہے اور اتفاقِ وقت کہ فاطمہؑ بنت اسد اس موقع پر خانۂ کعبہ ہی تک آ گئیں اور وہیں علیؑ کی ولادت ہو گئی۔ ورنہ اس میں علیؑ کا کیا دخل ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اولاً تو تاریخی واقعات اس اتفاق کے صریحی مخالف ہیں، ان میں الٰہی منصوبہ کے آثار پائے جاتے ہیں، اور قدرت کا انتظام صاف نظر آتا ہے لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ علیؑ خانۂ کعبہ میں پیدا ہو گئے تو کیا یہ بھی اتفاق تھا کہ فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ ہی تک آ گئیں، یہ بھی اتفاق تھا

کہ دیوارِ کعبہ میں در بن جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ جائیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ دیوار دوبارہ جڑ جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ تین دن تک ہزار کوششوں کے باوجود قفل نہ کھل سکے، یہ بھی اتفاق تھا کہ تین دن کے بعد دوبارہ دیوار میں در بن جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ مریم وحوا اور آسیہ وسارہ جیسی خواتین خدمت کے لئے چلی آئیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ استقبال کے لئے پہنچ جائیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ بچہ آغوشِ پیغمبرؐ میں آکر آنکھیں کھول دے اور اگر یہ سب اتفاق تھا تو یہ اتفاق کئی ہزار اختیارات سے بہتر ہے اور کیا کہنا اس بندے کی فضیلت کا جس کے سلسلے کے اتفاقات بھی فضائل بن جائیں اور جب اتفاقات نے فضائل کے دریا بہا دئیے ہیں تو جب اختیارات کا سلسلہ شروع ہوگا تو بات کس منزل تک پہنچے گی؟ اور مجھے تو کہنا پڑے گا کہ علیؑ کی منزل اتنی بلند ہے کہ اتفاق سامنے آئے تو خانۂ کعبہ زچہ خانہ بن جائے اور اختیار سامنے آئے تو ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری ہو جائے۔ صلوات۔

عزیزانِ محترم! یہ انکارِ فضیلت کا پہلا رُخ تھا، دوسرا رُخ اس سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خانۂ کعبہ میں بتوں کا اڈہ تھا اور بت پرستوں کا دستور تھا کہ جب کوئی مشکل پڑتی تھی تو خانۂ کعبہ تک اپنے بتوں سے دعا مانگنے آیا کرتے تھے۔ معاذاللہ جناب فاطمہ بنت اسد بھی دستورِ عرب کے مطابق انھیں بتوں سے دعا کرنے کے لئے آئی تھیں کہ اچانک دیوارِ کعبہ میں در پیدا ہو گیا اور وہ اندر چلی گئیں اور علیؑ ابن ابی طالب کی ولادت ہوگئی۔ میں کہوں گا کہ بے شک فاطمہ بنت اسد بتوں ہی سے دعا مانگنے گئی تھیں۔ اور

انھوں نے جب کہا تھا کہ پروردگار میں تجھ پر ایمان لائی، تیری کتابوں پر ایمان لائی، تیرے رسولوں پر ایمان لائی۔ تو ان کی مراد پروردگار سے بت ہی تھے، انھیں نے کتابیں نازل کی ہیں اور انھیں بتوں نے انبیاء کو نبی اور رسول بنایا ہے اور انھیں بتوں نے دیوار کو در بنا دیا ہے، اور انھیں بتوں نے دعاء قبول کر کے ایک بت شکن کو پیدا کر دیا ہو لیکن عزیز دانشا اور بتا دو کہ جب یہ سب کام بت کرتے ہیں تو تمھارا خدا کیا کرتا ہے؟ اور اس کا کیا مصرف ہے؟ اس کے اختیارات کیا ہیں؟ اور اس کے اپنے اعمال وافعال کیا ہیں؟۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتوں کی نسلی محبت ہے جو اس قسم کے تصورات پر آمادہ کر رہی ہے ورنہ کوئی مسلمان یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ جناب فاطمہؑ بنت اسد بتوں سے دعا کریں گی اور یہ سارے کرامات وکمالات بتوں سے ظہور میں آئیں گے، سچ ہے بت پرستوں کو بت ہی نظر آتے ہیں، بت شکن نہیں۔ صلوات،

لیکن اس مقام پر آنے کے بعد مجھے ایک فقرہ اور کہنا پڑے گا۔ کہ اس اعتراض کی گنجائش کہاں سے پیدا ہوئی اور یہ خیال مسلمانوں کے ذہن میں آیا کہاں سے کہ جناب فاطمہؑ بنت اسد بتوں سے دعاء کرنے کے لئے آئی تھیں، بات صرف یہ ہے کہ اگر آج خانہ کعبہ میں بت نہ ہوتے تو اس اعتراض کی گنجائش بھی نہ ہوتی، یہ انھیں بتوں کے وجود کا کرشمہ ہے کہ دعائے فاطمہؑ بنت اسد مشکوک بنا دی گئی۔ اور اس پر بتوں سے دعاء کرنے کا الزام لگا دیا گیا۔ تو ارباب کرم! ذرا اتنا اور سوچئے کہ اگر کہیں یہ بت آج تک رہ جاتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا، ہمارا ہر سجدہ مشکوک ہوتا، ہماری ہر نماز مشکوک ہوجاتی ہمارا ہر فریضہ مشکوک ہوجاتا، ہمارا ہر عمل مشکوک ہوجاتا، حد یہ ہے کہ ہمارا دفن و کفن

بھی مشکوک رہ جاتا۔ اور دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ مسلمانوں کو اللہ سے کوئی محبت نہیں ہے یہ تو بتوں کا کرشمہ ہے کہ یہ نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں، سجدے بھی کر رہے ہیں، اطاعتیں بھی کر رہے ہیں، عبادتیں بھی کر رہے ہیں۔ ان کا ہر عمل انھیں بتوں کے لئے ہے۔ خانۂ خدا تو فقط ایک بہانہ ہے جس کی طرف خواہ مخواہ رُخ مڑ جاتا ہے ـــــ بتایئے دنیائے اسلام میں اس الزام کا کوئی جواب تھا اور کس مسلمان میں اتنی ہمت تھی کہ اپنے عمل کے اخلاص کو ثابت کر سکتا اور دنیا کو یہ بتا سکتا کہ ہمارا عمل اللہ کے لئے ہے اس کا بتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جب یہ اثبات ممکن نہیں تھا تو ماننا پڑے گا کہ اُس انسان نے پوری دنیائے انسانیت و عبدیت پر احسان کیا ہے۔ جس نے خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا ہے اور سجدوں کو اللہ کے لئے بنا دیا ہے۔ یہی تو آپ نے علیؑ کی عظمت کیا ہے۔ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ دشمن نے اپنی جانب میں بنت اشد یہ الزام لگایا تھا لیکن یہی الزام فضائل کی بنیاد بن گیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ علیؑ نے خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک نہ کر دیا ہوتا تو مسلمانوں کی کل عبادت اور بندگی مشکوک ہو جاتی۔ اور علیؑ کا پوری دنیائے عبدیت و بندگی پر احسان ہے کہ انھوں نے سجدوں کو خلوص بخشا عبادتوں کو اخلاص عنایت کیا اور بتوں کی طرف جاتے ہوئے ذہنوں کو خدا کی طرف موڑ دیا۔ اور یہ بھی ایک بُت شکنی ہے جو علیؑ نے ولادت کے وقت انجام دی ہے۔ علیؑ صرف پتھروں کے بتوں کے بُت شکن نہیں ہیں، بلکہ علیؑ اس بت شکن کا نام ہے جس نے پتھر کے بت توڑے، غرور کے بت توڑے، شکوک و شبہات کے بت توڑے اور کعبۂ دل کو جملہ بتوں سے پاک کر کے عرش الرحمٰن بنا دیا، علیؑ نہ ہوتے تو خانۂ کعبہ بیت اللہ نہ کہا جاتا۔ اور علیؑ نہ ہوتے تو قلبِ مومن عرش الرحمٰن نہ بنایا جاتا۔ صلوات

عزیزانِ گرامی! بات آگئی ہے تو خاتمۂ کلام میں ایک اور فقرہ کہ کے آپ کی خدمت کو تمام کردوں کہ دنیا علیؑ کی اس فضیلت سے کیا مقابلہ کرے گی۔ انبیاء اس منزل پر نہیں پہنچے آپکو یاد ہوگا کہ جب جناب مریمؑ کے یہاں جناب عیسیٰؑ کی ولادت کا وقت آیا تھا تو بیت المقدس میں رہنے والی مریمؑ سے کہا گیا تھا کہ مریم باہر چلی جاؤ۔ یہ عبادت خانہ ہے زچہ خانہ نہیں ہے۔ اور جب علیؑ کی ولادت کا وقت آیا تو اپنے گھر میں رہنے والی بنت اسدؑ کو دیوار میں رستہ دے کے بلا لیا، حالانکہ بیت المقدس کی حیثیت عارضی تھی۔ وہ چند دنوں کے لئے قبلہ بنا یا گیا تھا، اور خانۂ کعبہ کی حیثیت دائمی ہے، وہ ہمیشہ کے لئے قبلہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ بیت المقدس جیسے گھر میں کلمتہ اللہ روح اللہ بلکہ بقول نصاریٰ (ابن اللہ) پیدا ہونے دیا جائے اور خانۂ کعبہ میں فرزند ابوطالبؑ پیدا ہو جائے۔

عزیزانِ محترم! یہ علیؑ نہیں پیدا ہو رہے ہیں، یہ قدرت واضح کر رہی ہے کہ جیسا تو جو شرف ابن اللہ، کلمتہ اللہ عیسیٰؑ کو نہیں ملا، وہ شرف فرزند ابوطالبؑ کو مل رہا ہے۔ اب فیصلہ کرو کہ ابوطالبؑ کافر ہیں یا مومن، اور فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ اگر میری حکمت اور عدالت پر اعتراض کیا تو تمہارا بھی ایمان نہ رہ جائے گا۔ عزیزو! ابوطالبؑ اس مردِ مومن کا نام ہے جو ایمان کی چہار دیواری میں رہتا ہے، اُدھر عبدالمطلبؑ اِدھر علیؑ، اُدھر فاطمہؑ بنت اسد، اِدھر رسول اکرمؐ، عبدالمطلبؑ کی وصیت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ صاحبِ ایمان ہیں۔ فاطمہؑ بنت اسد کی زوجیت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ مومن ہیں، رسول اکرمؐ کی تربیت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ حافظ اسلام و ایمان ہیں اور علیؑ کی ولادت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ صاحب ایمان نہیں بلکہ کل ایمان کے باپ ہیں۔ نعرۂ صلوات۔

علیؑ کی تاریخ میں یہ بحث بھی قابل توجہ ہے کہ علیؑ کی ولادت

بھی اللہ کے گھر میں ہوئی اور دنیا سے جاتے ہوئے علیؑ کی شہادت کا سلسلہ بھی اللہ کے گھر سے شروع ہوا،

زندگی کا آغاز بھی خانۂ خدا سے اور انجام بھی خانۂ خدا پر۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کی سوانح عمری میں ولادت و وفات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے، قدرت نے علیؑ کے آغاز و انجام کو مسجد سے مربوط کر کے واضح کر دیا کہ علیؑ والا وہی ہوگا جس کا ربط کعبہ و مسجد سے ہو، جو طواف کعبہ سے فرار کرے اور مسجد میں نماز پڑھنے سے کنارہ کشی کرے اس کا علیؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے، علیؑ آئے تو عظمتِ کعبہ کا اعلان کرتے ہوئے آئے اور گئے تو عظمتِ مسجد کا اعلان کرتے ہوئے۔ صلوات،

دوسری مجلس — داستانِ عزیمت مولائے کائنات ؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الاوّلین والآخرین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیّبین الطاھرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائھم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۔

مالکِ کائنات کا ارشاد ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

کتنا کریم ہے وہ مالک جس نے عالمِ ہستی میں انسانیت کو بے راہنما نہیں چھوڑا اور ہر دور میں ہدایت کی ذمہ داری لے کر انسانیت کو منزلِ کمال تک پہنچنے کا سہارا دے دیا، بدنصیب ہیں وہ افراد جو الٰہی راہنمائی سے فائدہ نہ اٹھائیں اور قدرت کے انتظامِ ہدایت کو چھوڑ کر اپنے انتظام کی فکر میں لگ جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد جو منزلِ تسلیم و رضا طے کرتے ہوئے اپنے اختیارِ حیات کو مالکِ کائنات کے حوالے کر دیں اور سراپا "اِنّا لِلّٰہ" کی تصویر بن جائیں۔

میں نے بارہا اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جسے پروردگارِ عالم ہدایتِ عالم کے لیے معین کرتا ہے اس کا انداز دنیا کے رہنماؤں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ عالم پیدا ہوتا ہے اور عالم رہتا ہے، وہ صاحبِ عصمت پیدا ہوتا ہے اور معصوم رہتا ہے، اس کی زندگی کمالات کا آئینہ ہوتی ہے، اور اس کے کمالات جمال و جلالِ الٰہی کا پرتو ہوتے ہیں۔

تفصیل کے ساتھ جلد۔ بنایانِ امّت کے حالات پہ تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ اتنی گنجائش ہے۔ صرف ایک فرد کے حالات پر ہلکی سی روشنی ڈالدینا چاہتا ہوں جس سے باقی افراد کے کردار کا بآسانی اندازہ ہوجائے گا اور یہ محسوس کرنا آسان ہوگا کہ جب پہلی منزل پر اتنا اہتمام ہے تو باقی منازل پر اس اہتمام کے نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟

مختصر الفاظ میں مولائے کائنات حضرت علیؑ بن ابی طالب کے حالاتِ زندگی اور آپ کی سیرتِ طیبہ پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ الٰہی راہنما کیسے سخت حالات میں اپنے فرائضِ ہدایت کو انجام دیتا ہے۔

مولائے کائناتؑ کی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کے ذاتی فضائل و کمالات کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آپ نفسانی کمالات اور روحانی فضائل میں کس منزل پر فائز تھے اور آپ کی منزل خدا و رسولؐ یا اہلِ دنیا کی نگاہ میں کیا تھی؟ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے کارناموں پر نگاہ کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آپ نے مساعد یا نامساعد حالات میں کس طرح زندگی گذاری ہے؟ اور اپنے گردوپیش کے حالات کو کس طرح برتا ہے؟

میرے لئے دونوں راستے ایسے ہیں جن کا طے کرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے، کہاں کرّار ابن ابی طالبؑ اور کہاں مجھ جیسا بندۂ ذلیل، کہاں ممدوحِ خدا و رسولؐ اور کہاں مجھ جیسا بے بضاعت مداح، کہاں ساقیِ کوثر کی شیلو اور کہاں یہ زبانِ نجس، کہاں بابِ مدینۃ العلم کی توصیف اور کہاں مجھ جیسا جاہل، کہاں گردشِ آفتاب کا پلٹانے والا اور کہاں میرا جیسا برگشتہ مقدر۔ لیکن اسی کا نام لے کر قدم آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ جہاں ٹھوکر کھاؤں گا وہ سہارا ضرور دے گا۔

اور جب کوئی مشکل پڑے گی وہ حل ضرور کردے گا، اور مشکلات میں اسے نہ پکاروں گا تو کسے پکاروں گا۔ دُوسرا کون ہے جو مشکلات میں کام آسکے، اور زندگی کے مسائل حل کرسکے۔ تجربہ بھی کہتا ہے کہ اسے بلاؤ جو غریبوں اور مفلسوں کے بلانے پر آجائے، اسے نہ بلاؤ جو پیغمبرؐ کے بلانے پر بھی نہ آئے۔ صلوات،

مولائے کائناتؑ کے ذاتی فضائل کو دیکھنا ہے تو آغازِ حیات سے دیکھئے پہلی ہی منزل پر وہ شرف نظر آئیگا جس میں کائنات کا کوئی انسان حصّہ دار نہیں ہے۔ اور دوسرے کا کیا ذکر، اس شرف میں خاتم النبیین کو بھی شریک نہیں بنایا گیا تو کسی دوسرے کو کیا بنایا جائے گا۔ یہ علیؑ کا تنہا شرف ہے کہ اوّلین و آخرین میں خانۂ کعبہ میں سوائے مولائے کائناتؑ کے کوئی دوسرا نہیں پیدا ہُوا، ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ علیؑ کو کوئی ایسا شرف دیا جائے جس سے نبیؐ کو بھی محروم رکھا جائے، کیا علیؑ کا مرتبہ نبیؐ سے بالاتر ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں۔؟ لیکن میں عرض کروں گا کہ ایک ولادت کا کیا ذکر ہے۔ شہادت کی منزل کو دیکھ لیجئے جہاں خود محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اللہ نے مصلحتاً اپنے حبیب کو شرفِ شہادت سے الگ رکھا ہے اور مصلحت یہ ہے کہ اگر حضورؐ کو تلوار کی شہادت دی جاتی تو زہر کی شہادت سے محروم رہ جاتے اور اگر زہر کی شہادت دی جاتی تو تلوار کی شہادت سے محروم رہ جاتے، دونوں شہادتیں بیک وقت ممکن نہیں تھیں، اس لئے اللہ نے آپ کو شہادت سے الگ کرکے آپ کے فرزند حسنؑ و حسینؑ کو دونوں طرح کی شہادت دی تاکہ ان کی شہادت نبیؐ کی شہادت بن جائے اور ان کے ذریعہ سے نبیؐ کے کمالات کی تکمیل ہوجائے ـــــ اب اگر محدث دہلوی کی نگاہ میں

شہزادوں کی شہادت سے نبیؐ کی شہادت کی تکمیل ہو سکتی ہے تو دونوں کی ولادت سے نبیؐ کے شرفِ ولادت کی بھی تکمیل ہو سکتی ہے۔

اور مجھے تو اس منزل پر یہ کہنا ہے کہ محدث دہلوی کی تحقیق میں بھی مولائے کائنات کے فضائل کا ایک پہلو نظر آتا ہے کہ اللہ نے پیغمبرؐ کو درجۂ شہادت اسلئے نہیں دیا کہ ایک نہ ایک شرفِ شہادت سے محروم رہ جائیں گے اور درجۂ شہادت نامکمل رہ جائے گا۔ مگر کیا کہنا مولائے کائناتؑ کا کہ انھیں دونوں شرف براہِ راست مل گئے اور کسی واسطہ کی ضرورت نہیں پڑی۔ دشمن یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم نے زہر میں تلوار بجھائی ہے اور علیؑ بچ نہ سکیں گے اور علیؑ مطمئن تھے کہ دشمنی ہی سے میرے شرف کی تکمیل ہو رہی ہے اور بیک وقت زہر کی شہادت بھی مل رہی ہے اور تلوار کی شہادت بھی نصیب ہو رہی ہے۔ صلوات۔

ولادت کے بعد ایک نظر علم و فضل پر ڈالنا ہوگی جہاں یہ دیکھنا ہے کہ مولائے کائنات کے علم کی منزل کیا ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے خانۂ کعبہ کے قریب آجائیے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ فاطمۂ بنت اسد خانۂ کعبہ سے آرہی ہیں، پیغمبرِ اسلامؐ استقبال کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ بچہ نبیؐ کی آغوش میں آرہا ہے اور آنکھیں کھول کر تقاضہ کر رہا ہے، خدا کے حبیب کچھ پڑھوں۔؟ پیغمبرؐ نے اجازت دی تو توریت و انجیل و زبور و قرآن کی تلاوت شروع کر دی، اور اس انداز سے تلاوت کی کہ نبیؐ کو کہنا پڑا کہ آسمانی صحیفے یوں پڑھے کہ ان کے انبیاء بھی نہ پڑھ سکتے تھے، اور قرآن حکیم اس طرح پڑھا جو تلاوت کرنے کا حق تھا۔ صلوات۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جو بچہ پیدا ہو کر آسمانی صحیفوں کی تلاوت

کر سکتا ہے۔ اس کی جوانی کا درجۂ کمال کیا ہوگا ہے۔ اور یہ تو میں نے رسم دنیا کی بنا پر کہہ دیا ورنہ یہاں تو کمال کی وہ منزل ہے جہاں بچپنے اور جوانی کا کوئی فرق نہیں ہے۔ جو منزل ہے وہ منزل کمال ہے اور جو عمر ہے وہ عمر فضائل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بچپنے میں نبیؐ نے کمال دیکھا تھا تو انھوں نے سند فضیلت دے دی، اور آگے چل کر ساری دنیا کمالات کا مشاہدہ کرے گی تو سب عتراف فضیلت کریں گے۔ اور اپنوں کا کیا ذکر ہے جو غیر ہیں وہ بھی یہی کہیں گے کہ "اگر علی نہ ہوتے تو سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں تھا۔"

دنیائے اسلام کا اتفاق ہے کہ اسلام میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس کا سلسلہ علیؑ بن ابی طالب سے نہ ملتا ہو۔ علم قرآن ہو یا تفسیر، علم حدیث ہو یا فقہ، علم فرائض ہو یا علم احکام، علم تصوف ہو یا علم کلام، علم نحو ہو یا علم صرف، علم منطق ہو یا علم فلسفہ، علم شعر ہو یا علم کتابت، علم خطابت ہو یا علم حساب، علم ہیئت ہو یا علم جفر۔ کوئی علم ایسا نہیں ہے جس کا سلسلہ مولائے کائناتؑ سے نہ ملتا ہو۔ اور اس کی قرآنی دلیل بھی یہ ہے کہ اللہ نے علیؑ کو وارث کتاب اور امام مبین قرار دیا ہے اور جو کچھ کتاب میں ہے وہ سینۂ علیؑ میں ہے اور جو کچھ کائنات میں ہے وہ قلب امام مبین میں ہے، یہی علم ہے جسے دیکھ کر نبیؐ نے فرمایا تھا کہ میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ جسے شہر کے پاس آنا ہو وہ دروازے سے آئے اور یہی علم تھا جس کا مشاہدہ کر کے دنیائے علم و فلسفہ سربسجود تھی اور آج تک ہے۔ اور اسی علم کا کرشمہ تھا کہ مسجد کوفہ سے مسلسل اعلان ہو رہا تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔ قبل اس کے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہ جاؤں۔ میرے پاس زمین و آسمان دونوں کا

علم ہے، اسے بکھر سینے میں علم کا خزانہ ہے، میں اس بلندی پر ہوں جہاں سے علم کا سیلاب بہہ کر نکلتا ہے اور جہاں تک کسی کا طائرِ خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔

تاریخ کائنات میں کوئی اس شان کا دعویٰ کرنے والا نہیں ملا، مگر علیؑ نے یہ دعویٰ کرکے واضح کردیا کہ اہلِ دنیا میرے علم کا مقابلہ کیا کریں گے وہ میرے علم کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، تخت و تاج پر قبضہ کرلینا آسان ہے، مسند علم پر جلوہ گر ہونا مشکل ہے، یہ میری ہی منزل ہے جہاں یہ اعلان کر رہا ہوں کہ اگر مسندِ علم بچھا دی جائے اور مجھے بٹھا دیا جائے تو توریت والوں کے درمیان توریت سے فیصلہ کروں گا، انجیل والوں کے درمیان انجیل سے فیصلہ کروں گا، زبور والوں کے درمیان زبور سے فیصلہ کروں گا اور قرآن والوں کے درمیان قرآن سے فیصلہ کروں گا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ قرآن کی کون سی آیت کہاں نازل ہوئی ہے، کب نازل ہوئی ہے کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کا مفہوم کیا ہے، اس میں ناسخ و منسوخ کیا ہے، عام و خاص کیا ہے، محکم و متشابہ کیا ہے، میرے سینے میں علوم کا ایک دریا موجزن ہے مگر افسوس کہ کوئی لینے والا نہیں ہے اور کسی میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

یہ انداز اعلان ہی بتا رہا ہے کہ علیؑ کا کمال کیا ہے، اور علیؑ کا دور کیا تھا، کس انداز سے بیقرار تھے کہ کوئی علم لینے والا مل جائے، اور کس طریقہ سے کوشش ہو رہی تھی کہ کوئی درِ اہلبیتؑ پر نہ جانے پائے، اس اندازِ ظلم کا کوئی جواب ہو سکتا ہے کہ حقائقِ قرآن کو جاننے والے سے قرآن نہ لیا جائے اور جاہلانِ امت تفسیرِ قرآن کرنے بیٹھ جائیں وارثِ کتاب سے علمِ کتاب نہ لیا جائے اور صاحبانِ تخت و تاج کتاب کو لاوارث بنا دیں: مجھے تو کہنا پڑے گا کہ یہ اہلِ دنیا کی بدنصیبی تھی کہ انھوں نے درِ اہلبیتؑ کو

چھوڑ دیا اور ان سے علم نہ لیا، ورنہ در اہلبیتؑ پر کیا کمی ہے، یہاں فرشتے علم لینے آئے، جنّات علم لینے آئے، آسمان والے علم لینے آئے، اہلِ زر آئیں یا نہ آئیں ابوذر آئے، سلمان آئیں یا نہ آئیں سلمان آئے۔ بشر آئیں یا نہ آئیں ملک آئے، صاحبانِ اقتدار آئیں یا نہ آئیں سیّد الملائکہ آئے اور روایت گواہ ہے کہ جب بزمِ پیغمبر میں جبرئیل کی موجودگی میں علیؑ آگئے تو جبرئیل تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے، پیغمبرِ اسلامؐ نے مسکرا کر پوچھا "جبرئیل تم نے علیؑ کی تعظیم کیوں کی؟" عرض کی "حضور کو تو معلوم ہی ہے کہ علیؑ کا مجھ پر حق ہے اور استاد کی تعظیم ضروری ہے"۔ فرمایا "جبرئیل یہ تمھارے استاد کیسے ہو گئے؟" عرض کی "سرکار! جب مجھ سے عرشِ اعظم پر سوال کیا گیا کہ "جبرئیل تم کون ہو اور میں کون ہوں؟" تو میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا جواب دوں۔ ایک مرتبہ میں نے اسی نور کو دیکھا کہ آواز دے رہا ہے۔ جبرئیل کہہ دو کہ میں عبدِ ذلیل ہوں اور میرا نام جبرئیل ہے اور تو ربِّ جلیل ہے اور تیرا نام بھی جلیل ہے"۔ اربابِ نظر آپ تعجب نہ کریں، جب ساکنِ جنت آدمؑ ملائکہ سے علم میں افضل ہو سکتے ہیں تو قسیمِ جنت علیؑ کیوں کر افضل نہیں ہو سکتے۔ صلوات،

علم کے ساتھ شجاعت کو دیکھا جائے تو گہوارہ میں کلۂ اژدر کے ٹکڑے نظر آئیں گے۔ سخاوت کو دیکھا جائے گا تو ڈیوڑھی پر زمین سے لے کر آسمان تک والوں کی قطاریں نظر آئیں گی اور جب کوئی یہ کہے گا کہ حاتم کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ مکان میں چالیس دروازے تھے اور ایک ایک سائل کو ہر دروازے سے دیا کرتا تھا تو مسکرا کر فرمائیں گے کہ ایک ہی دروازے سے اتنا کیوں نہ دیا کہ چالیس دروازوں پر جانے کی زحمت نہ ہوتی۔

زہد و قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام زندگی ایک غذا پر گزار دی، اور جب شبِ شہادت بیٹی نے نمک اور دودھ لا کر افطار میں رکھا تو فرمایا۔ بیٹی ام کلثومؑ! ان میں سے ایک چیز کو اٹھا لو۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ تمھارے باپ نے ایک وقت میں دو غذائیں نہیں استعمال کیں اور اس سے بالاتر یہ اعلان کہ جب تک میرے حدود مملکت میں کوئی ایک بھوکا رہ جائے گا میں شکم سیر ہو کر نہ کھاؤں گا۔

مملکتِ اسلامیہ کے فقیروں کو دیکھ کر کھانا کھانے والا امام اور اس کے مقابلہ میں وہ افراد لائے جائیں جنھیں اپنے گھر اور محل کی بھی خبر نہ ہو، کردار علیؑ آواز دے رہا ہے کہ سماج سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارنے والے کو غنی کہا جاتا ہے اور سماج کو مالامال کر دینے والے انسان کو جناب امیر کہا جاتا ہے، صلوات،

محنت و مشقت کا یہ عالم تھا کہ کبھی غرباء کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، کبھی باغ میں مزدوری کر رہے ہیں، کبھی کھیت میں پانی دے رہے ہیں، کبھی بازار میں چرمے فروخت کر رہے ہیں، کبھی دستِ مبارک سے نعلین کی اصلاح کر رہے ہیں، کبھی چاہنے والوں کی امداد کر رہے ہیں، کبھی دشمنوں کی مشکل کشائی کر رہے ہیں اور پھر ہر منزل پر دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں لیکن دنیا کو بتا رہے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اسلام نہیں ہے، قوتِ بازو کا مظاہرہ کر کے زندگی گزارنا اسلام ہے، کاہل اور سست انسان صاحب تاج و سفر ہوتا ہے، اور زورِ بازو کا مظاہرہ کرنے والا فاتح خیبر ہوتا ہے، صلوات،

ان کمالات کے ساتھ اگر عبادات کا بھی جائزہ لیا جائے تو عالم ہی دوسرا نظر آئے گا، کس کی مجال ہے کہ زندگی بھر کی عبادتوں کا حساب لگا سکے جب کہ

خندق کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری ہے اور کس کی مجال ہے کہ ساری ریاضتوں کا حساب کر سکے جبکہ ایک رات کا سو جانا مرضئ پروردگار کی قیمت بن جائے صلوات۔

لیکن بہر حال اجمالی طور پر یہ عرض کرنا ہے کہ علیؑ کے اعمال نگاہِ قدرت میں اس قدر عزیز اور بلند ہیں کہ جیسے آیاتِ قرآن منتظر بیٹھی ہیں، علیؑ کس عمل کا مظاہرہ کریں اور ہم عرشِ اعظم سے زمین کی طرف قصیدہ بنکر آجائیں، نماز پڑھیں تو ہم مدح سرائی کریں، زکوٰۃ دیں تو ہم سر پر تاجِ ولایت رکھیں، جہاد کریں تو ہم بنیانِ مرصوص کا پیغام سنائیں، سائلوں کو روٹی دیں تو ہم سورۂ دہر لے کر جائیں، چادر میں آجائیں تو آیتِ تطہیر نازل کردیں، مباہلہ میں جائیں تو صداقت کا اعلان کردیں، خیبر فتح کرلیں تو محبّتِ خدا و رسولؐ کی تعریف کریں اور غدیر میں مولا بن جائیں تو دین کے کمال اور نعمتوں کے اتمام کی سند دیدیں۔ صلوات۔

علیؑ کی عبادتوں میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ سر غیر خدا کے سامنے نہیں جھکا اور خدا کے سامنے بھی کسی طمع یا خوف کی بناء پر نہیں جھکا بلکہ اپنے اخلاص کا اعلان یوں کیا کہ خود بارگاہِ احدیت میں عرض کی پروردگار میں نے تیری بندگی جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے نہیں کی ہے، تجھے بندگی کا اہل پایا ہے تو سر جھکایا ہے، گویا علیؑ واضح کر رہے ہیں کہ اہلِ دنیا ہوشیار ہو جائیں علیؑ کا سر کسی نا اہل کے سامنے نہیں جھک سکتا، علیؑ کو طمعِ جنت اور خوفِ جہنم نہیں ہے تو دنیا کے خزانے اور سلاطین کے تازیانے علیؑ کو کیا جھکا سکیں گے۔

علیؑ کی عبادت کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی بندگی کسی طمع یا خوف کی بناء پر نہیں تھی بلکہ اہلیت و استحقاق کی بناء پر تھی یعنی خدا اہل اور حقدار تھا اس لئے علیؑ

نے سر جھکا دیا ورنہ اس کے سامنے بھی نہ جھکتے، تو اب کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ علیؑ کسی نااہل کے سامنے سر نہیں جھکاتے اور حیاتِ مرتضیٰؑ میں کسی بت پرستی کا امکان نہیں ہے اور یہ وہ فضیلت ہے جس کا اعتراف اور احساس ساری دنیا کو ہے کہ آج بھی عالمِ اسلام میں سب رضی اللہ عنہ ہیں صرف علیؑ کرم اللہ وجہہ ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ سب کے سر بتوں کے سامنے جھکے ہیں، علیؑ کا سر کسی کے سامنے نہیں جھکا، اور یہی تو وجہ ہے کہ سب کے لئے رضائے خدا کی دعا ہو رہی ہے اور علیؑ نے ہجرت کی رات بسترِ پیغمبرؐ پر سو کر رضائے الٰہی کا سودا کر لیا ہے۔

بات کو طول بڑھ جاتا ہے اور ابھی حیاتِ مولائے کائنات کا دوسرا پہلو بالکل تشنہ ہے۔ اس لئے دل چاہتا ہے کہ مختصر لفظوں میں اُدھر بھی اشارہ کر دیا جائے، یہ ذاتی کمالات ایک طرف دنیا کے ساتھ علیؑ کا برتاؤ اور اسلام میں مولائے کائناتؑ کی خدمات کا جائزہ لینا ہے تو اس خاکہ کو نگاہ میں رکھنا ہوگا اور حیاتِ علی مرتضیٰؑ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک حصہ حیاتِ پیغمبرِ اسلامؐ میں اور ایک حصہ بعد پیغمبرِ اسلامؐ، تاکہ یہ تجزیہ آسان ہو جائے کہ حیاتِ پیغمبرؐ میں علیؑ کے کارنامے کیا تھے اور بعد پیغمبرِ اسلامؐ مولائے کائنات نے کیسی کر زندگی گزاری ہے اور آپ اور امتِ اسلام کے کس طرح کام آئے ہیں؟

یہ تقسیم کوئی جدید تقسیم نہیں ہے، حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک ضروری تقسیم ہے کہ جس طرح پیغمبرِ اسلامؐ کے کردار کے تجزیہ کے لئے مکہ اور مدینہ کی زندگی کو دو حصوں میں بانٹنا پڑے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ عالمِ غربت اور بے کسی میں رسولؐ کا کردار کیا تھا اور اعوان و انصار کے مل جانے کے بعد زندگی کا انداز کیا رہا، اسی طرح مولائے کائناتؑ کی زندگی کو بھی دو حصوں پر بانٹنا پڑے گا اور حیات و

وفاتِ رسولؐ دونوں کے ماحول میں کردار کا جائزہ لیا جائے گا بلکہ بعد رسولؐ بھی دو قسم کے حالات کو دیکھنا پڑے گا کہ خانہ نشین رہے تو کیا انداز رہا اور تختِ حکومت پر آ گئے تو کیا انداز رہا۔

تفصیلات سے قطع نظر ایک لمحہ کے لئے یہ دیکھنا ہو گا کہ حیاتِ پیغمبرِ اسلامؐ تک علیؐ کے کتنے فضائل و کمالات اور کارنامہ ہائے حیات سامنے آئے ہیں اور ان میں مولائے کائناتؑ کا کیا انداز رہا ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں عرض کر دیا جائے کہ آئے تو خانۂ خدا میں آئے۔ خانۂ کعبہ سے آغوشِ پیغمبرؐ میں آئے، آغوشِ پیغمبرؐ میں تلاوتِ قرآن کی، آغوش سے گہوارے میں آئے تو اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک مدّت تک باپ کے ساتھ رہے: اس کے بعد رسول اکرمؐ کی معیت میں آ گئے، دس گیارہ برس کی عمر میں پیغمبرِ اسلامؐ نے اعلانِ رسالت کیا اور سارے قبیلہ کو جمع کر کے اسلام کا پیغام سُنایا تو اس دعوت کا پُورا انتظام علیؑ کے ہاتھوں سے ہوا۔ اعلانِ رسالت پر کفار و مشرکین نے ساحر، کاہن اور مجنون کہا تو علیؑ نے نصرتِ پیغمبرؐ کا وعدہ کیا، اور وعدۂ نصرت کے بعد قدم قدم پر رسولؐ پر جان قربان کرتے رہے۔ پیغمبرؐ مکّہ کی گلیوں میں رہے تو علیؑ پیچھے پیچھے چلتے رہے اور کفار سے مقابلہ کرتے رہے۔ نبیؐ شعب ابی طالب میں گئے تو راتوں کو اپنا بستر بدل کے نبیؐ کے بستر پر سوتے رہے تاکہ حملہ ہو جائے تو میں قتل ہو جاؤں، میرا رسولؐ بچ جائے۔ تین سال کے محاصرہ کے بعد حکمِ ہجرت ہوا تو تمام رات تلواروں کی چھاؤں میں سو کر رضائے الٰہی کا سودا کیا، صبح کو اُٹھے تو کفار و مشرکین کی امانتیں واپس کر کے وقارِ نبوت کو بچایا، ناموس رسالت کو لے کر مکّہ سے مدینہ کی طرف چلے اور پیغمبرؐ اس وقت تک مدینہ میں داخل

نہیں ہوئے جب تک علیؑ آ نہیں گئے۔ گویا پیغمبرؐ اعلان کر رہے تھے کہ یاد رکھو، نہ میں نے مکہ میں کارِ تبلیغ علیؑ کے بغیر شروع کیا ہے نہ مدینہ میں شروع کرونگا۔

میں عرض کروں گا یا رسول اللہؐ! کل آپ تنہا تھے تو علیؑ کا انتظار کر رہے تھے، آج خدا رکھے آپ اکیلے نہیں ہیں۔ امت کے بزرگ و تجربہ کار آپ کے ساتھ ہیں، اب علیؑ کی کیا ضرورت ہے؟ آپ فرمائیں گے "میں یہی تو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اسلام کے مسائل میں کس کس پر اعتماد کیا ہے، یاد رکھو! میری جان خطرے میں تھی تو علیؑ کو بستر پر لٹایا تھا، میرا وقار خطرہ میں تھا تو علیؑ کو امانتوں کے واپس کرنے کا ذمہ دار بنایا تھا اگر اسلام خطرات سے دوچار ہونے والا ہے تو علیؑ کے بغیر ایک قدم نہ اٹھاؤں گا۔

کاش دنیا کو اس بات کا احساس ہو جاتا کہ اہلِ دنیا کی یہی بساط و اوقات ہے، علیؑ کے بغیر نبیؐ قدم نہیں اٹھاتے اور جب نبیؐ، علیؑ کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں تو ہم علیؑ کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے۔ ہمارا تو کھلا ہوا اعلان ہے کہ جس علیؑ کا سہارا لے کر نبیؐ اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف گئے ہیں، اسی علیؑ کا سہارا لے کر ہم اپنی آخری منزل جنت کی طرف جائیں گے۔

مدینہ منورہ آنے کے بعد حضورؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا عقد علیؑ سے کیا اور ساری درخواستوں کو رد کر کے وحی الٰہی کے فیصلہ پر کیا کہ نور کا رشتہ نور ہی سے ہو سکتا ہے۔ ظلمت کو نور سے رشتہ کی ہوس بے کار ہے۔

اور یہ بھی عجب قیامت ہے کہ جس کے حصہ میں نور کا رشتہ آیا، وہ ایک نور والا بھی نہ کہا گیا، اور جس کے حصے میں ظلمت کے رشتے آئے وہ دو دو نور والا ہو گیا۔ عقد زہراؑ و علیؑ کی سادگی دلیل ہے کہ اسلامی رشتہ میں مہمل رسوم کی

گنجائش نہیں ہے۔ یہاں تقریب کو سادہ ہونا چاہیئے، مہر کو نقد ہونا چاہیئے، جہیز کو مہر کی مقدار کے اندر ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہر رسم اسلام میں داخل انداز کا ہے اسلام نہیں ہے۔ کاش علیؑ و فاطمہؑ کے غلام و کنیز اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوتے اور سماج کو مبتلائے مصائب نہ کرتے۔

عقد کے بعد اسلامی معرکوں کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے ۲ھ میں بدر کا معرکہ پیش آیا، جس میں سقائی لشکر کا فریضہ علیؑ ہی نے انجام دیا۔ اور سارے مسلمانوں کے برابر کفار تنہا علیؑ ہی نے قتل کیا۔ بدر کے بعد ۳ھ میں احد کی منزل آئی، یہاں بھی سارے مسلمانوں کے میدان سے بھاگ جانے کے بعد ثبات قدم کا مظاہرہ علیؑ ہی نے کیا اور جب پیغمبر اسلامؐ نے پوچھا کہ یا علیؑ سب چلے گئے، تم کیوں نہیں گئے؟ تو عرض کی سرکار! میں آپ کے نقشِ قدم پر ہوں، میں ایمان کے بعد کفر نہیں اختیار کر سکتا۔ اب کوئی پوچھے کہ یا علیؑ کیا میدانِ جنگ سے بھاگ جانا کفر ہے اور اگر کفر ہے تو بھاگنے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

عزیزانِ محترم! آپ دیکھ رہے ہیں کہ عالم اسلام کا جو سچا خلیفہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹوکتے بھی نہیں کہ یا علیؑ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، بھلا فرار کو کفر سے کیا تعلق ہے ——؟ تو کیا یہ دونوں بھائیوں کا مشترک فیصلہ ہے کہ ایک اعلان کر رہا ہے۔ اور دوسرا اپنی خاموشی سے اس کے اعلان کی تائید کر رہا ہے اور اس طرح حضرت پیغمبرؐ سے منہ موڑنے والوں کے مسلک کا اعلان ہو رہا ہے۔

احد کے بعد ۵ھ میں خندق کا معرکہ پیش آیا جہاں عمرو بن عبدود

کے حملے کے بعد بھی مسلمانوں کے سر نہیں اُٹھے اور پیغمبر اسلامؐ کے اصرار پر بھی کوئی نہیں گیا تو بالآخر علیؑ ہی نے جا کر عمرو کا سر قلم کیا اور نبیؐ نے آواز دی۔ آج علیؑ کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری ہے۔" صلوات،

خندق کے بعد ۶ھ میں صلح حدیبیہ کی منزل آئی۔ جہاں پیغمبر اسلامؐ حج کے ارادے سے نکلے اور کفار کی مزاحمت کے بعد صلح کی نوبت آگئی، جس پر بہت سے مسلمانوں نے اعتراض بھی کیا اور پیغمبر اسلامؐ کی رسالت میں شک بھی کیا تو صلح کی دستاویز علیؑ ہی کے ہاتھوں سے مرتب ہوئی اور صلح نامہ کی کتابت کا کام علیؑ ہی نے انجام دیا۔ نہ کوئی کاتب وحی نظر آیا، نہ کاتب الہام، صرف ایک علیؑ تھے جو صلح نامہ مرتب کر رہے تھے اور نبیؐ لکھوا رہے تھے۔ اور قرآن اس صلح کو فتح مبین قرار دے کر دنیائے اسلام کو متوجہ کر رہا تھا کہ اسلام میں تلوار کا فاتح بھی علیؑ ہے اور اسلام میں قلم کا فاتح بھی علیؑ ہے۔ صلوات،

حدیبیہ کے بعد ۷ھ میں خیبر کا معرکہ سامنے آتا ہے جہاں یہودیوں کے قلعوں کو فتح کرنے کے لئے بعض مسلمان سپاہی میدان تک جاتے ہیں اور اُلٹے پاؤں واپس چلے آتے ہیں اور بقول تاریخ "سردار یہ کہتا ہے کہ لشکر کمزور ہے اور لشکر یہ کہتا ہے کہ سردار بزدل ہے اور آخر کار نبیؐ عملی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اسلام کے لئے دونوں بیکار ہیں اور کرار غیر فرار کا خطاب دے کر علیؑ کو میدان میں بھیجتے ہیں اور علیؑ مرحب و عنتر کو تہ تیغ کر کے خیبر کو فتح کر کے واپس آتے ہیں۔ صلوات،

خیبر کے بعد ۸ھ میں مکہ فتح ہوتا ہے، جہاں پیغمبر اسلامؐ خانہ کعبہ میں بت شکنی کا فرض انجام دیتے ہیں اور علیؑ کو حکم دیتے ہیں کہ میرے

دوشِ پر سوار ہو کر طاقِ کعبہ سے بُت گراؤ اور علیؑ دوشِ رسولؐ پر بلند ہو کر اپنا فتہ فضیلت بھی ظاہر کر دیتے ہیں اور دنیا کو بتا دیتے ہیں کہ رسول اسلامؐ نے خانۂ حق سے باطل کے قبضے کے ہٹانے کا کام مجھ ہی سے لیا ہے اور خلیل کے مقابلہ میں اس جہاد کا فرض میں نے ہی انجام دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے پیادہ جہاد کیا تھا اور میں نے دوشِ رسولؐ پر سوار ہو کر جہاد کیا ہے۔ صلوات،

فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں مباہلہ کی منزل آتی ہے، جہاں عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا ثابت کرنے کے لئے مدینہ آتے ہیں، اور آیاتِ قرآن کے نزول کے باوجود ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور آخر کار قرآن مجید مباہلہ کا حکم دیتا ہے تو نبیؐ اس شان سے برآمد ہوتے ہیں کہ گود میں حسینؑ ہوتے ہیں۔ انگلی پکڑے ہوئے امام حسنؑ۔ حضورؐ کے پیچھے شہزادیٔ کائنات فاطمہ زہراؑ اور ان کے پیچھے نفسِ پیغمبرؐ علیؑ بن ابی طالب۔ مباہلہ ختم ہوتا ہے، نصاریٰ اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں اور تاریخ آواز دیتی ہے۔ مسلمانو! اب آلِ محمدؐ کا احسان پہچانو، اب تک تو میدانوں میں بعض اصحاب نظر بھی آجاتے تھے، اب اسلام کے اس معرکۂ حق و صداقت میں سوائے آلِ محمدؑ کے کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ مسلمان فضائلِ آلِ محمدؐ کو مانیں یا نہ مانیں عیسائیت کو احساس ہے کہ ہماری شکست اہلبیت سے ہوئی ہے، اصحاب سے نہیں۔

اور شاید اسی فضیلت کو باقی رکھنے کے لئے اللہ نے عیسیٰؑ کو بچا رکھا ہے کہ اسلام کے آخری راہنما کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو دنیائے اسلام کو بھی آلِ محمدؑ کے کمالات و احسانات کا اندازہ ہو جائے۔ صلوات،

مباہلہ کے بعد ۱۰ھ میں یمن کی مہم پیش آتی ہے، جہاں مولائے کائناتؑ

تبلیغ اسلام کر کے پورے قبیلہ ہمدان کو مسلمان بناتے ہیں اور واپسی پر نبیؐ کے ساتھ آخری حج میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جس کی واپسی پر میدانِ غدیر میں حاجیوں کا قافلہ رکا جاتا ہے اور پیغمبر اسلامؐ منبر پر جا کر علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کر کے آواز دیتے ہیں۔ "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے" اور قرآن مجید تکمیل دین کا اعلان کرتا ہے اور اُمت سے دستِ علیؑ پر بیعت لی جاتی ہے تاکہ مسلمانوں کو ہوش آ جائے کہ علیؑ کا ہاتھ بیعت لینے کے لئے پیدا ہوا ہے، بیعت کرنے کے لئے نہیں۔ صلوات،

غدیر کے ۲ مہینہ دس دن کے بعد ۲۸ صفر سلہ ھ کو حضور سرورِ کائنات کا انتقال ہوتا ہے، جہاں سے علیؑ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور اُمت کے علیحدہ ہو جانے کے بعد علیؑ، پیغمبرؐ کو غسل و کفن دے کر دفن کر دیتے ہیں اور دنیا کو متوجہ کر دیتے ہیں کہ تخت و تاج کے لئے دوڑنے والے اور ہیں اور نبوت کی تجہیز و تکفین کرنے والے اور ـــــ اور سچ ہے، جو جس کا مقصد ہوتا ہے وہ اس کے لئے ہر آن کوشاں رہتا ہے۔ دنیا کا رشتہ تخت و تاج سے ہے اور میرا رشتہ مرسلِ اعظمؐ سے ہے، کل کعبہ سے مجھے پیغمبرؐ لائے تھے، آج آخری منزل تک پیغمبرؐ کو میں پہنچا رہا ہوں۔

اربابِ کرم! ـــــ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا کہنے کو بہرحال جی چاہتا ہے کہ آج کی دنیا میں بھی اگر کوئی جنازہ چھوڑ کر الگ ہو جائے تو اچھا خاصہ رشتہ بھی ختم ہو جاتا ہے، خدا جانے یہ کیسی عقیدت وارادت تھی کہ جنازۂ رسولؐ چھوڑ کر بھی رشتۂ محبت برقرار رہ گیا۔؟

یہی نہیں، بلکہ فیصلۂ خلافت کے بعد اہلبیتؑ کی طرف مصائب کا رُخ

موڑ دیا جاتا ہے اور پُرسہ دینے کے بجائے بیٹی کی جائداد پر قبضہ کیا جاتا ہے داماد کو قیدی بنایا جاتا ہے، دروازے پر آگ اور لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں اور دربارِ حکومت میں کھینچکر طلب کیا جاتا ہے اور قتل کی دھمکی دے کر بیعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جب مولائے کائناتؑ فرماتے ہیں کہ تم ایک اللہ کے بندے اور نبیؐ کے بھائی کو قتل کر رہے ہو، تو جواب ملتا ہے کہ ہم تمہیں بندۂ خدا تو تسلیم کرتے ہیں لیکن رسولؐ کا بھائی تسلیم نہیں کرتے، دیکھا آپ نے انقلاب اُمّت، جب یہ اُمّت علیؑ کے نبیؐ کا بھائی ہونے سے انکار کر سکتی ہے تو اگر باغِ فدک اور منصبِ حکومت کا انکار کر دے تو کیا تعجب ہے، علیؑ نے اس مصیبت پر بھی صبر کیا اور قرآن جمع کر کے پیش کیا، وہ بھی رد کر دیا گیا، مصائب پیش آتے رہے اور علیؑ حسب وصیتِ پیغمبرؐ خاموش رہے۔

تھوڑے عرصہ کے بعد حکومت بدلی، اور حکومت کا دوسرا دور آیا، اس دور میں بھی مصائب میں اضافہ ہی ہوا، اور جسمانی اذیتوں کے ساتھ روحانی اذیتیں بھی نمایاں طور سے شامل ہو گئیں، کل اپنے حقوق کا انکار ہو رہا تھا اور اب پردہ دینِ خدا پر حملہ ہو رہا تھا اور اب کھلم کھلا احکامِ الٰہیہ کی مخالفت ہو رہی ہے، حلال خدا کو حرام کیا جا رہا ہے اور حرام خدا کو حلال بنایا جا رہا ہے اور حق علیؑ کے پامال کرنے کی عظیم سازش ہو رہی ہے کہ ایک طرف جاگیر فدک کے ساتھ حق خمس کو بند کر دیا گیا کہ آل محمدؐ کے پاس کوئی دولت باقی نہ رہ جائے اور دوسری طرف چلتے چلتے نئی حکومت کا ایسا منصوبہ بنایا گیا کہ خلافت مولائے کائنات تک پہنچنے ہی نہ پائے۔ چھ آدمیوں کی کمیٹی بنائی گئی، اکثریت پر فیصلہ رکھا گیا،

مخالف سے قتل کا فرمان نافذ ہوا۔ ایک شخص کو ثالث فرض کیا گیا اور ان سب کے بعد بھی جب علیؑ کے حق کا انکار ممکن نہ ہو سکا تو سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کی شرط لگائی گئی۔ مولائے کائنات نے وقت وصیت ہی اس سازش کو محسوس فرما لیا اور آپ کو معلوم تھا کہ یہ خلافت مجھ تک آنے والی نہیں ہے اس لئے آپ نے چاہا کہ خلافت نہیں ملتی ہے تو نہ ملے، کم از کم اس خلافت کی حقیقت تو واضح ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا، کہ سیرتِ شیخین مطابقِ سیرتِ رسولؐ ہے تو اس شرط کی ضرورت نہیں ہے اور مخالفِ سیرتِ رسولؐ ہے تو میں سیرتِ رسولؐ سے ہٹ کر کسی شے پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں ــــ خلافت نہیں ملی اور دوسرے کو دے دی گئی۔ لیکن علیؑ کا سوال آج بھی محفوظ ہے اور مسلمانوں کو چیلنج کر رہا ہے کہ بتاؤ یہ سیرت، سیرتِ رسولؐ کے موافق ہے یا مخالف؟۔ اور علیؑ آواز دے رہے ہیں کہ مجھکو چھوڑنے والا سیرتِ رسولؐ کو بھی نہیں پا سکتا، سیرتِ رسولؐ میری ہی سیرت کا نام ہے، جو مجھ سے الگ ہو گیا وہ رسولؐ سے الگ ہو گیا اور جو رسولؐ سے الگ ہو گیا وہ خدا سے الگ ہو گیا۔ اب خدا سے الگ ہونے والے کے بارے میں تم فیصلہ کرو۔؟

عزیزانِ محترم! اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ علیؑ نے سیرتِ حکام پر عمل کرنے سے انکار کر کے ایک مسئلہ اور بھی واضح کر دیا کہ اگر علیؑ نے کل حکامِ وقت کی بیعت کر لی ہوتی تو آج سیرت کو ضرور قبول کر لیتے، مولاؑ نے سیرت کو ٹھکرا کر واضح کر دیا کہ جب میں سیرت کے نام پر پوری حکومت چھوڑ سکتا ہوں تو مجھ سے یہ توقع ہرگز نہ رکھنا کہ میں کسی اقتدار سے مرعوب ہو کر باطل کے سامنے سر جھکا دوں گا

اور غیر حق کی بیعت کر لوں گا۔

تاریخ کے دس سال یہ بھی گزر گئے اور حکومت کا تیسرا دور آ گیا۔ اس دور میں بھی مصائب و مظالم کا سلسلہ اسی شدت کے ساتھ جاری رہا اور دین خدا کی توہین و تذلیل ہوتی رہی۔

بنی امیہ پر وظائف و انعامات تقسیم ہوئے اور بنی ہاشم کے گھر فاقے ہوتے رہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب خلیفہ سوم کو حکومت ملی تو رئیس خاندان حضرت ابو سفیان نے آ کر کہا۔ بیٹا! اب یہ خلافت تمھارے قبضہ میں آ گئی ہے۔ اس گیند کو جس طرح چاہو نچاؤ، خبردار جنت و جہنم کے چکر میں نہ پڑنا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہم نہیں جانتا کہ سعادتمند فرزند نے بزرگ خاندان کی بات مانی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس بات پر ابو سفیان کو ٹوکا بھی نہیں اور یہیں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر خلافت میں جنت و جہنم کا انکار نہ ہوتا تو ملوکیت میں خسروچی کو بنی ہاشم کا کھیل نہ بنایا جاتا، یہ بنی امیہ کا قدیم عقیدہ تھا جو اب تک چھپکے چھپے زمانہ سے چلا آ رہا تھا، اور اب یزید نے اس پردہ کو چاک کر دیا۔ یزید میں اور دوسروں میں اتنا ہی فرق ہے کہ دوسروں نے بات کو پردہ میں رکھا تھا اور یزید نے پردہ کو ہٹا دیا تاکہ دنیا پہچان لے کہ یزیدیت ہر دور میں رہی ہے اور سفیانیت آج بھی زندہ ہے اور اس طرح یہ بھی واضح ہو جائے کہ حسینیت ہر دور میں رہی ہے اور محمدیت آج بھی زندہ ہے اور یہی معنی ہیں "حُسَيْنٌ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْ حُسَيْنٍ" کے۔

تقریباً بارہ سال تک مظالم کا یہ سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور دین الٰہی کی توہین و تحقیر ہوتی رہی، یہاں تک کہ ام المؤمنین عائشہ کی کوششوں سے خلیفۂ ثالث کا قتل واقع ہوا۔ اور مسلمان لاوارث ہو گئے۔ اب مشکلات تھیں، اور

مشکل کشا نہ تھا، مسائل تھے اور حلال مسائل نہ تھا، شریعت تھی اور محافظِ شریعت نہ تھا، قرآن تھا اور مفسرِ قرآن نہ تھا، اسلام تھا اور ذمہ دارِ اسلام نہ تھا، امت تھی اور قائدِ امت نہ تھا، آخر امت عاجز آکر درِ علیؑ پر آئی اور آواز دی یا علیؑ! اب مشکلکشا آپ ہیں، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں، ہم سے بیعت لے لیجئے علیؑ نے انکار کیا، اور جب اصرار بڑھا تو مسجدِ پیغمبرؐ میں منبر پر بیٹھ کر بیعت لی اور ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں تمہاری بیعت کا محتاج نہیں ہوں، تم میری بیعت کے محتاج ہو۔ کل یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی اور آج سمجھ میں آ گئی۔ سچی بات کو جب ٹھوکر لگتی ہے تو یا علیؑ کہنا ہی پڑتا ہے۔ صلوات۔

تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا، اور علیؑ کی حکومت سے مایوس ہونے کے بعد ام المومنین نے خونِ عثمان کے انتقام کا نعرہ بلند کیا۔ مولائے کائنات پر قتلِ عثمان کا الزام لگا کر انتقام کے لئے جمل کے میدان تک آ گئیں۔ مولائے کائنات نے لاکھ سمجھایا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور آخرکار جمل کی لڑائی ہوئی۔ ام المومنین کی شکست ہوئی۔ حضرت علیؑ کو فتح نصیب ہوئی لیکن آپ نے نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ انھیں مدینہ پہنچا دیا کہ دنیا پہچان لے کہ عزتِ پیغمبرؐ کا محافظ کون ہے اور ناموسِ رسولؐ کو سرِ میدان لانے والا کون ہے اور اس طرح حق و باطل کا فیصلہ بھی ہو جائے۔

جمل کی آگ سرد نہ ہوئی تھی کہ انتقام کی دوسری مہم شام سے شروع ہوئی اور صفین کا میدان گرم ہو گیا، یہاں بھی لڑائی علیؑ کی فتح پر تمام ہوئی لیکن اچانک حکومتِ شام نے نیزوں پر قرآن بلند کر کے جنگ کا رخ بدل دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہم قرآن سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں، اب دیکھیں علیؑ کا مسلک کیا ہے؟ مولائے کائنات نے جنگ روک دی، اور مالکِ اشتر کو واپس بلا لیا اور دنیا پر واضح کر دیا کہ ہم وہ محافظِ قرآن

ہیں جو عزتِ کتاب کے لئے جیتی ہوئی جنگ بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ قرآن کو چھوڑ کر حکومت کرنا تمہارا کام ہے اور قرآن کی عزت کے نام پر حکومت چھوڑ دینا ہمارا کام ہے۔

جنگ رکی، طرفین کے حکم معین ہوئے اور آخر میں ایک گہری سازش کے نتیجہ میں مولائے کائنات کے خلاف فیصلہ ہوگیا، فیصلہ میں اس قرآن کا نام بھی نہ آیا جس کے لئے جنگ رکی تھی اور اس طرح مولائے کائنات کے لشکر میں بھی بغاوت کی ایک لہر دوڑ گئی اور آپ کو نہروان کی لڑائی سے دوچار ہونا پڑا۔ الحمدللہ کہ آپ اس میں بھی فاتح رہے۔

بات تمام ہوگئی لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خلافتوں کے دور میں علیؑ سے تین محاذوں پر جنگ کیوں ہوئی اور ان لڑائیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ جنگوں کی نوعیت حقیقت کا فیصلہ کر رہی ہے کہ ان جنگوں میں ایک میں خلیفۂ اول کی بیٹی قائد تھیں، اور دوسری میں خلیفۂ دوم کا بنایا ہوا "گورنر خاندان" اور تیسری میں بنی امیہ کے ہوا خواہ خوارج اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر صحابیت نے اہلبیتؑ کے خلاف محاذ آرائی نہ کی ہوتی تو آج مسلمانوں میں یہ بحث نہ ہوتی، اور شاید تاریخ کے اس تسلسل کو امام غزالی نے محسوس کر لیا تھا، جب یہ فتویٰ دیا تھا کہ "واعظ پر ذکرِ شہادتِ حسینؑ حرام ہے کہ اس سے بغضِ صحابہ پیدا ہوتا ہے"۔

میرے گزارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امیرالمومنینؑ نے اپنا چہار سالہ دورِ حکومت ایسی ہی پریشانیوں اور الجھنوں میں گزارا لیکن اپنے فریضۂ ہدایت سے غافل نہیں رہے اور جب زندگی کا آخری لمحہ آیا اور شام کی سازش سے خوارج نے قتلِ علیؑ کا منصوبہ بنایا تو اس وقت بھی آپ قدم قدم پر اپنا فرضِ ہدایت ادا کرتے رہے۔

کیا دنیائے اسلام اس قیامت خیز رات کو فراموش کر سکتی ہے جب کائنات کا امیر اپنی بیٹی کے گھر مہمان تھا اور بیٹی نے افطار میں دُودھ اور نمک لا کر حاضر کیا تو فرمایا، میری لال ام کلثوم! تجھے معلوم ہے کہ تیرے باپ نے ایک وقت میں دو غذائیں نہیں کھائیں۔ بیٹی! دودھ کا پیالہ اٹھا لو۔

کسے معلوم تھا کہ مولا نے دودھ کا پیالہ کیوں اٹھوا دیا؟ ۔ راز تو اس وقت کھلا جب ابن ملجم کی تلوار سر اقدس پر لگی اور مولا زخمی ہو کر بیت الشرف میں تشریف لائے اور جرّاح نے زخم سر دیکھ کر دُودھ تجویز کیا۔

عزادارو! ۱۹ ویں شب افطار سے فارغ ہونے کے بعد مولا کا یہ عالم تھا کہ بار بار حجرۂ عبادت میں تشریف لے جاتے تھے اور نکل آتے تھے اور فرماتے تھے "بیشک یہ وہی رات ہے"! بیٹی نے گھبرا کے پوچھا۔ بابا جان! یہ کون سی رات ہے؟ فرمایا۔ میری لال یہ میری اور تیری جدائی کی رات ہے، یہ وہ رات ہے جس کی پیغمبر اسلامؐ خبر دے گئے ہیں، جس کے بعد مجھے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونا ہے، بیٹی! دیکھ تیرا باپ کس طرح لرز رہا ہے۔ آج مجھے دنیا کے کسی بہادر سے مقابلہ نہیں کرنا ہے آج مجھے رب العالمین کی بارگاہ میں جانا ہے۔

رات گزرتی رہی، سحر کا ہنگام آیا، تجدید وضو فرما کر گھر سے باہر نکلنے کا قصد کیا، مرغابیوں نے بڑھ کر دامن تھاما، پلٹ کر امام حسن کو دیکھا، فرزند! ان جانوروں کا خیال رکھنا ان میں کوئی بھوکا پیاسا نہ رہ جائے، اگر ان کے آب و دانہ کا انتظام نہ ہو سکے تو انہیں آزاد کر دینا، میں کسی کو بھوکا پیاسا نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

ارباب عزا! یہ کوفہ ہے کوفہ! کاش کوئی اہلِ کوفہ میں اس وصیت کو سُنتا اور یاد رکھتا کہ علی جانوروں کی بھوک اور پیاس برداشت نہیں کر سکتے،

اور کل انھیں علیؑ کی اولاد ہوگی جن کے خیموں سے العطش العطش کی آوازیں بلند ہوں گی بھی چاہتا ہے عرض کروں، مولاؑ! آپ کے گھر کے جانور پیاسے نہ رہیں اور آپ کی اولاد صحرائے کربلا میں تین دن کی پیاس، ننگاہوں کے سامنے دھواں، زبانوں پر العطش العطش، وا محمدا وا علیاہ وا حسیناہ کی آوازیں۔

عزادارانِ امیرالمومنینؑ! مولاؑ بیت الشرف سے باہر چلے، امام حسنؑ اور امام حسینؑ ساتھ چلے۔ مڑکر دیکھا، کہا بیٹے لال واپس جاؤ، آج تمھارا گھر میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ شہزادے واپس ہوگئے، لیکن کسے معلوم تھا کہ مولاؑ نے کیوں واپس کر دیا، یہ تو باپ جانے یا فرزند۔ راز اس وقت کھلا جب علیؑ کا سجدہ شروع ہوا اور سرِ اقدس پہ ابنِ ملجم کی تلوار لگی، فضا میں قد قُتِلَ امیرالمومنینؑ کی آواز گونجی اور شہزادی زینبؑ و ام کلثومؑ تڑپ کر بھائی کے پاس آئیں۔ بھیا! یہ میں کیا سن رہی ہوں کیا بابا مارے گئے؟ بھیا جلدی مسجد میں جاکر بابا کی خبر لائیے۔ میں کہوں گا شہزادی آج بھائی گھر میں موجود ہے، باپ کی خبر گیری کے لئے بھیج دیجئے لیکن بی بی! کل جب فضائے کربلا میں آواز گونجے گی "اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا" تو کسے میدان میں بھیجے گا، جو مقتل سے بھائی کی خبر لائے۔ عجب نہیں۔ شہزادی آواز دیں کہ میں خود ٹیلہ تک جاؤں گی اور بھائی کے گلے پر چلتا ہوا خنجر دیکھ کر آواز دوں گی ابنِ سعد! میرا ماں جایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔

عزادارو! مولاؑ مسجد میں آئے، آخری فرضِ ہدایت انجام دیا، گلدستہ پر اذان کہی، صحنِ مسجد سے قاتل کو بیدار کیا، اور دنیا کو یہ پیغام سنا کر مصلے پر آئے کہ علیؑ وقتِ نماز قاتل کا سونا بھی برداشت نہیں کر سکتا تو چاہنے والوں کا بے نمازی ہونا کیونکر برداشت کرے گا۔

نماز شروع کی، سر سجدۂ خالق میں رکھا، ابن ملجم کی تلوار چلی، ستونِ مسجد نے چراغِ مسجد بجھے، فضا میں کہرام برپا ہوا، آسمانوں میں تلاطم پیدا ہوا، روح الامین تڑپ کر چلائے نبی کا بھائی مارا گیا، علیؑ شہید ہوگئے۔ ستونِ ہدایت گر گیا، رسیمانِ ہدایت ٹوٹ گئی۔

بیت الشرف تک آواز پہنچی، سیدانیوں میں کہرام برپا ہوا، نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوئیں، شہزادے مسجد تک آئے، امام حسنؑ نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور دنیا کو سبق دیا کہ خبردار قتلِ علیؑ کو مسجد میں نہ جانے کا بہانہ قرار نہ دینا، مجھ سے زیادہ علیؑ کا چاہنے والا کون ہوگا، میں وارثِ علیؑ اور فرزندِ علیؑ ہوں، میں نے ٹھیک وقت ضربت مسجد میں آکر نماز پڑھائی ہے اور ہمیشہ مسجد میں نماز پڑھی ہے، خود مولائے کائنات نے ۱۹ ویں ماہِ رمضان کی صبح سب کچھ جانتے ہوئے مسجد میں آکر واضح کر دیا کہ علیؑ جان دے سکتا ہے مسجد کو ترک نہیں کر سکتا، ورنہ گھر ہی میں نماز ادا کر لیتا اور بظاہر خطرہ سے محفوظ رہتا۔

اس کے بعد شہزادے باپ کو لے کر چلے، بیت الشرف کے قریب پہنچے امیرالمومنینؑ نے آواز دی۔ بیٹا حسن! چاہنے والوں کو واپس کردو، اب گھر قریب آگیا ہے، میں نہیں چاہتا کہ نامحرموں کے کانوں میں میری بیٹیوں کی آواز جائے،

میں کہوں گا، مولاؑ یہ سنتہ ۴۰ھ کا کوفہ ہے جو چاہیے وصیت کر لیجئے، ابھی عمل کرنے والے فرزند موجود ہیں، لیکن مولاؑ کل سنتہ ۶۱ھ کا کوفہ ہوگا، جب سجے ہوئے بازار ہوں گے تماشائیوں کا مجمع ہوگا، طمانچوں کا ہجوم ہوگا، ہر طرف آئینہ بندی ہوگی، جشن کا سامان ہوگا، اور اسی عالم میں آپ کی بیٹیاں رسن بستہ لائی جائیں گی، آپ کے فرزند عابدِ بیمار کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوقِ خاردار۔ آپ کی زینبؑ زبانِ حال سے فریاد کر رہی ہوگی، بابا! مجھے دور نہیں ہے، آپ کی بیٹی آپ کے دارالحکومت میں آرہی ہے، بابا! آپ کو گوارا نہیں تھا کہ آپ کی بیٹی کی آواز نامحرموں کے کانوں میں جائے، اب تو

زینب آپ کو پکار بھی نہیں سکتی، ہر طرف نامحرموں کا ہجوم عام ہے، کس کس سے منہ چھپاؤں، کیسے پردہ کروں، بابا! زینب کے سر پر چادر نہیں ہے، بیٹی کے سر کے بال کھلے ہوئے ہیں۔ بابا شرم و حیا سے یوں ہی نظر نہیں اٹھتی اور جب کبھی نظر اٹھ جاتی ہے تو سامنے نوکِ نیزہ پر آپ کے حسینؑ کا سر نظر آتا ہے، بابا! آپ کو اپنے حسینؑ سے بڑی محبت تھی اور آج آپ کا حسینؑ آپ کے شہر میں آرہا ہے اور آپ لینے نہیں آتے۔

۱۹ رمضان کو آپ بہن ام کلثوم کے گھر مہمان تھے اور آج ام کلثوم آپ کے گھر مہمان بن کے آئی ہے، بابا! ذرا اٹھ کے دیکھئے آپ کی سکینہ کا کیا عالم ہے۔ یہ کمسن بچی، یہ یتیمی، یہ قید کی محنت، یہ بے کسی، یہ اسیری اور یہ عالم غربت۔

یہ اپنی لال کی غربت تو دیکھئے بابا
نہیں ہے باپ تو گودی میں لیجئے بابا
عجیب آپ کے عابد کا حالِ زار بھی ہے
کمالِ ضعف بھی ہے طوقِ خاردار بھی ہے
سلام مملکتِ غم کے تاجدار سلام
سلام بیکسِ بھرے گھر کے سوگوار سلام
جو ہو سکے تو کبھی کربلا بھی جائیے گا
گلے سے تربتِ بے شیر بھی لگائیے گا
مدد کرو مرے بابا کہ شام جاتی ہوں
برہنہ سر سرِ بلوائے عام جاتی ہوں

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

جنابِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

اسمِ مبارک	:	فاطمہؑ ،
لقب	:	زہرا ، بتول ، صدیقہ وغیرہ ،
کنیت	:	ام الائمہ ، ام ابیہا ،
والد ماجد	:	حضرت محمد مصطفےٰؐ ،
والدۂ ماجدہ	:	جنابِ خدیجہؑ ،
ولادت	:	۲۰؍ جمادی الثانیہ ۵ بعثت ، مکہ معظمہ
اولاد	:	امام حسنؑ ، امام حسینؑ ، جنابِ زینبؑ ، جنابِ ام کلثومؑ ، جناب
شہادت	:	۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۱ھ یا ۳ جمادی الثانیہ ۱۱ھ مدینہ منورہ ،
عمرِ مبارک	:	۱۸؍ سال ،
قبرِ مطہر	:	بین قبر و منبرِ رسولؐ یا جنت البقیع

تیسری محفل داستانِ عظمت صدیقہ طاہرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِہِمْ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی۔

مالکِ کائنات کا ارشاد ہے۔ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

یہ ایک ایسے صادق القول کا قول ہے جس کے کلام میں غلطی اور فریب کا کوئی امکان نہیں ہے، اور جب اس نے کہہ دیا ہے کہ ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے تو چاہے تاریخ میں کوئی ثبوت ملے یا نہ ملے یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے ہر دور، ہر عہد، ہر زمانے اور زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت کا انتظام کیا ہے اور ایسا نہ ہوتا تو چند ہزار سال کی مدت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور پھر ان کے اوصیاء و خلفاء کی گنجائش کہاں ہوتی۔ انبیاء کی کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے کوئی خطۂ ارض کوئی علاقۂ زمین اور کوئی زمانہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو، اور اس انتظام میں یہ لحاظ نہ رکھا ہو کہ جس دور میں جیسی ضرورت ہو ویسا ہی نبی بھیجا جائے، ویسی ہی کتاب نازل کی جائے۔ ویسا ہی قانون بنایا جائے اور ویسی ہی شریعت مقرر کی جائے تاکہ انسان اس قانون سے فائدہ اٹھا سکے اور نمائندۂ پروردگار حالاتِ زمانہ کے مطابق دنیا

کی ہدایت کرسکے۔

اس مقام پر یہ مسئلہ ضرور قابلِ غور ہے کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں ایک کو بھی عورت نہیں بنایا۔ اور پوری تاریخ ہدایت میں کسی ایک عورت کو بھی یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ منصب نبوت و رسالت کی حامل ہو، ایک سے ایک صاحب ایمان و کردار خواتین گزریں اور ایک سے ایک بلند نفس سنگلات صفحۂ ارض پر سامنے آئیں لیکن کسی ایک کو بھی منصب الٰہی نہیں دیا گیا، تو کیا یہ سوچ لیا جائے کہ معاذاللہ دینِ خدا میں عورت کا کوئی مرتبہ نہیں ہے یا دینِ الٰہی بھی عورت کے حق میں اتنا ہی ظالم ہے جتنے ظالم دنیا کے دوسرے قوانین ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو عورتوں کو منصب ہدایت کیوں نہیں دیا گیا اور انھیں اس شرف سے کیوں محروم رکھا گیا؟

تاریخ انسانیت میں بے شمار عورتیں گزری ہیں جنھوں نے قیادت کا منصب سنبھالا ہے اور بااحسن وجوہ انجام دیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ عورت کی حکومت کبھی کامیاب نہیں ہوئی اور اس نے دنیا کو صالح نظامِ زندگی نہیں دیا تو مجھے معاف فرمائیں، مردوں کے دامن بھی کچھ کم داغ دار نہیں ہے۔ زبان سے کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن ایک مرتبہ دونوں کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو سارا حال معلوم ہو جائے گا۔ روئے زمین پر پہلا خون مرد ہی نے بہایا ہے، بطیلۂ نوح سے کھلی بغاوت مرد ہی نے کی ہے جناب ابراہیم کو آگ میں مرد ہی نے پھینکا ہے جناب موسیٰ کو آوارۂ وطن مرد ہی نے بنایا ہے، جناب عیسیٰ کو اپنی جانب میں سولی پر مرد ہی نے چڑھایا ہے، بندگانِ خدا کو لوٹ کر خزانے جمع کرنے والا قارون مرد ہی تھا، خدا کے مقابلہ میں دعائے خدائی کرنے والا نمرود مرد ہی تھا کعبہ کے مقابلہ میں

گرجا بنانے والا ابرہہ مرد ہی تھا، اور اس کے مقابلہ میں دوسری طرف قصر فرعون میں موسیٰ کی پرورش کرنے والی آسیہ عورت تھیں، عیسیٰ کو شر یہود سے پناہ میں رکھنے والی مریم عورت تھیں، جناب اسمٰعیلؑ کے لئے شدت عطش میں پانی فراہم کرنیوالی ہاجرہ عورت تھیں، مرسلِ اعظمؐ کو سکونِ زندگی عطا کرنے والی خدیجہ عورت تھیں، بلکہ یہ ایک عورت زہراؑ تو نہ بیت کی غربت دولت سے تبدیل ہوتی، نہ تکذیب کا ماحول تصدیق میں منقلب ہوتا، نہ کاسہ لیسوں کا مجمع ہوتا، نہ کلمہ گویوں کا ہجوم ہوتا نہ بزم پیغمبرؐ میں بھیڑ بھاڑ ہوتی نہ اسلام میں یہ شان و شوکت نظر آتی اور مجھے تو یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ اسلام میں صدر اسلام کے ٹکڑے توڑنے والے اور دولت نے کر غنی و مالدار بن جانے والے مرد تھے اور اپنے ٹکڑوں پر پوری امت کو پالنے والی فاطمہ زہراؑ کی ماں خدیجۃ الکبریٰؑ عورت تھیں، صلوات،

یہ نہ کہئے کہ عورت کو کوئی شعور نہیں ہے، عورت کا کوئی کردار نہیں ہے، عورت کا کوئی ایمان نہیں ہے اور جب یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر سوال اپنے مقام پر ہے کہ اللہ نے عورتوں کو منصب دار کیوں نہیں بنایا۔

ساری دنیائے اسلام اس ایک سوال کے سامنے انگشت بدنداں ہے اور تقریر و تحریر سے "اسلام میں عورتوں کے حقوق" ثابت کرنے والے علماء اسلام اس سوال کے مقابلہ میں ساکت و صامت نظر آتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ اسلام نے عورتوں کو عزت دی ہے، وقار بخشا ہے، مرتبہ دیا ہے، میراث میں حصہ دیا ہے، شہادت کا حق دیا ہے، کسب معاش کی اجازت دی ہے، نکاح کرنے کا اختیار دیا ہے، تعلیم و تدریس کے حقوق دیئے ہیں، اولاد پر اطاعت واجب کرکے شہزادی کا رتبہ دیا ہے، شوہر کی شریک حیات بنا کر گھر کا ذمہ دار بنایا ہے، باپ کی

آغوش میں رکھ کے قابل تعظیم واحترام بنایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی عزت ومحبت کے باوجود منصب کیوں نہیں دیا، اور سوالاکھ نبیوں میں ایک آدھ عورت کو یہ عہدہ کیوں نہیں بخشا؟

میرے خیال میں یا تو دُنیائے اسلام اس اعتراض کا جواب دے اور دنیائے کفروالحاد کو مطمئن کرے کہ حقوقِ نسواں کا نعرہ بلند کرنے والا اسلام اس منزل پر کیوں خاموش ہے اور یہاں عورتوں کے حقوق کی حمایت ورعایت کیوں نہیں کی گئی۔ اگر یہ امر ممکن نہیں ہے اور اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہے تو صاف لفظوں میں اعتراف کرلے کہ جہاں تک حقوق کا تعلق ہے اسلام نے کسی منزل پر عورتوں کو محروم نہیں رکھا اور نہ مردوں سے پیچھے رکھا ہے، لیکن منصب کے معاملہ میں اس کی دنیا دوسری ہے، اس کا تعلق مرد اور عورت سے نہیں ہے بلکہ مصلحت الٰہی اور علم پروردگار ہے۔ بات صرف مرد وعورت کی ہوتی تو دنیا کے سارے مرد نبوت ورسالت کے دعویدار ہوجاتے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد سے کروڑوں اور اربوں مرد صاحب ایمان وکردار گزرے ہیں اور ہیں لیکن کسی کو منصب نبوت ورسالت نہیں ملا۔ جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ منصب خدائی مصلحت سے وابستہ ہے۔ اس میں علم وقابلیت اور استعداد وصلاحیت کی بحث نہیں ہے، قابلیت وصلاحیت اور کردار وایمان شرطِ منصب ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر صاحب ایمان وکردار کو منصب دے دیا جائے اور ہر قابل وفاضل انسان نبی اور رسول بن جائے۔ اور جب دنیائے اسلام نے عاجز آکر یہ اعتراف کرلیا تو ایک قدم مجھے بھی آگے بڑھنا پڑا کہ جب عورتوں کی نبوت وامامت کا مسئلہ آیا تو مجھے

تسلیم کر لیا کہ یہ کام خدا کا ہے، ہمارا نہیں ہے، اور جب اپنے گھر کی قیادت وخلافت کا مسئلہ آیا تو سب نے طے کر لیا کہ یہ حق بندوں کا ہے خدا کا نہیں ہے۔

احباب کرام! میرا تمام دنیائے اسلام کو چیلنج ہے کہ یا تو عورتوں میں کوئی ایسا نقص ثابت کریں جس کے بعد ان میں منصب کی صلاحیت نہ رہ جائے یا یہ اعتراف کر لیں کہ عہدہ الٰہی اللہ کے اختیار میں ہے، اس میں امت کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ صلوات۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی صاحب یہ نہ سوچیں کہ آپ نے نبوت کا قیاس خلافت اور امامت پر کیوں کر لیا؟ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ نبوت و رسالت میں ایک ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کا وجود عورت میں نہیں ہو سکتا اور اس کا علم صرف ذاتِ پروردگار کو ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے مردوں کو نبی و رسول بنایا ہے عورتوں کو نہیں بنایا۔ لیکن اس کا قیاس خلافت وامامت پر نہیں ہو سکتا اور امت نے بعد پیغمبر جو اختیار لیا ہے وہ خلافت وامامت کا اختیار ہے، نبوت و رسالت کا اختیار نہیں ہے۔

لیکن احباب کرام! مجھے پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اگر یہ طے ہو جائے کہ نبوت و رسالت میں ایسی خصوصیت ہے جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور خلافت و امامت میں ایسی کوئی شئے نہیں ہے تو امتِ اسلامیہ نے پیغمبر اسلامؐ کے بعد امہات المومنین کو خلیفۂ رسول کیوں نہیں بنایا؟ جبکہ یہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے کہ محبت رسول، علم و فضل، روایت و حدیث وغیرہ کے اعتبار سے وہ ہر خلیفہ سے بہتر تھیں، جملہ خلفائے اسلام کی حدیثیں سب ملا کر اتنی نہیں ہیں جتنی حدیثیں صرف ام المومنین عائشہ کی ہیں جبکہ خلیفۃ المسلمین کو رسولؐ سے

وہ قربت اور محبت حاصل نہیں تھی جو ام المومنین کو حاصل تھی، اور کسی کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ نے اتنی رعایتیں نہیں برتی تھیں جتنی ان کے ساتھ برتی ہیں، اور کسی کی اس قدر ناز برداری نہیں کی ہے جتنی ان کی ناز برداری کی ہے تو پھر امت نے یہ عہدہ انھیں کیوں نہیں دیا۔ اور گستاخی معاف! مجھے تو یہ شکوہ خود ان کے والد بزرگوار سے ہے کہ انھوں نے منبر رسولؐ پر جا کر یہ تو کہدیا کہ علیؑ کے ہوتے ہوئے میں خلافت کا اہل نہیں ہوں، یہ کیوں نہ کہا کہ اپنی دختر نیک اختر کے ہوتے ہوئے یہ حق مجھے نہیں پہنچتا اور قاعدہ کے اعتبار سے یہ منصب انھیں ملنا چاہیئے۔

ممکن ہے کوئی نافہم یہ اعتراض کرے کہ نبیؐ کے بعد امت اسلامیہ اور شہر نبی پر چاروں طرف سے حملے کے امکانات تھے، منافقین منتظر بیٹھے تھے، مشرکین خار کھائے تھے، یہودی اپنی شکست کے انتقام کی فکر میں تھے، عیسائی الگ جلے ہوئے تھے اور مرتدوں کا فتنہ الگ سر اٹھا رہا تھا ایسے موقع پر اسلام کو علم و فضل، جمال و کمال، روایت و حدیث سے زیادہ لشکر کشی اور معرکہ آرائی کی ضرورت تھی، اس لئے یہ منصب کسی عورت کو نہیں دیا جا سکتا تھا، ورنہ اسلام کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن ارباب کرم! میں کسی عام عورت کی گفتگو نہیں کر رہا ہوں، میں ایک مخصوص خاتون کی گفتگو کر رہا ہوں، میری بحث جناب فاطمہ زہراؑ سے نہیں ہے کہ ان کے بارے میں یہ کہدیا جائے کہ ان میں معرکہ آرائی اور لشکر کشی کی صلاحیت نہیں تھی، میری گفتگو ایک ام المومنین سے ہے جن میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی اور وقت کے خلیفہ سے کچھ زیادہ ہی تھی، خلیفۂ وقت کو تو میدان میں مقابلہ کرتے نہیں دیکھا گیا لیکن ام المومنین کو

بہر حال میدانِ جمل میں دیکھا گیا ہے، بھر ان کی خلافت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ جہاں جہاں خلیفۂ وقت کے دل میں مروّت پیدا ہو گئی تھی وہاں بھی وہ سخت اقدامات کرتیں اور کسی سے مروّت سے کام نہ لیتیں۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ خالد بن ولید کے معاملہ میں خلیفۂ رسولؐ نے صحابیٔ رسول سمجھ کر مروّت سے کام لیا اور انکی ناقابلِ معافی غلطی کو نظرانداز کر دیا لیکن ام المومنین اپنے نظریات میں اتنی سخت تھیں کہ صحابیٔ رسول کیا نفسِ رسول کو بھی معاف نہیں کر سکیں اور لشکر لے کر مقابلہ پر آ گئیں۔

تاریخ کے یہ حقائق گواہ ہیں کہ رسول اکرمؐ کے بعد اسلام میں اتنا عظیم انقلاب آیا تھا کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں تھا اور جب یہ امت رسولؐ کی چہیتی بیوی کی نہ ہوئی تو اکلوتی بیٹی کی کیا ہوگی اور جب خلافت کی دوڑ میں بزرگوں کو بچّوں کا خیال نہ رہ گیا تو دوسروں کا کیا خیال آئیگا؟

ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ دینِ اسلام میں نہ خدا نے عورتوں کو عہدہ دیا ہے نہ امّت نے، تو اب یہ سوال بہر حال رہ جاتا ہے کہ پروردگار اگر عورت اس قابل نہیں ہے تو اس کی ہدایت کا کیا انتظام ہوگا؟ اور مرد اس کی عملی ہدایت کیوں کر کریں گے، وہ اس کے اعمال بجا لانے سے قاصر ہیں اور وہ ان کے اعمال سے استفادہ کرنے سے عاجز ہے تو پھر درمیانی راہ کیا نکلے گی؟

قدرت نے آواز دی گھبراؤ نہیں، میں منصب نہ دوں گا لیکن عورتوں میں بھی ایسی پاکیزہ کردار خواتین پیدا کر دوں گا جن کا عمل عورتوں کے لئے شمع ہدایت بن جائے گا اور جن کے نقش قدم پر چل کر دنیا کی عورتیں دنیا و آخرت کی نیکیاں

حاصل کرلیں گی، میں ان کے کردار کی ضمانت لوں گا، میں انھیں زیور عصمت سے آراستہ کروں گا اور انھیں طیب و طاہر بناؤں گا کہ مردوں کی طہارت کا اعلان کروں یا نہ کروں ان کی طہارت کا اعلان ضرور کروں گا۔ عصمت مریم پر وقت پڑے گا تو ان کی طہارت کا اعلان کروں گا اور چادر زہراؑ میں اجتماع ہوگا تو ان کے حق طہارت کا اعلان کروں گا۔

ارباب کرم! میں نے بار بار عرض کیا ہے کہ جسے خداوند عالم ہدایت کا انتظام سپرد کرتا ہے اس کی خلقت میں بھی ایک خاص اہتمام رکھتا ہے، چنانچہ مریم کو نمونۂ عمل بنایا تو انھیں اپنے گھر کے لئے وقف کر دیا اور فاطمہ زہراؑ کو قیامت تک کے لئے شریکۃ الرسل بنایا تو ولادت میں وہ اہتمام رکھا کہ کائنات کی کسی خاتون کے لئے نہیں کیا گیا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب جناب خدیجہؑ نے تمام اشراف قریش سے عقد کرنے سے انکار کر دیا اور امانت و دیانت پیغمبر کو دیکھ کر از خود پیغام عقد دے کر رسول اکرمؐ سے عقد کر لیا، تو عرب میں ایک کھلبلی مچ گئی: "خدیجہ نے یتیم عبداللہ سے عقد کر کے ہماری سیادت و قیادت کی توہین کی ہے۔ ایک غریب و نادار سے عقد کر کے ہماری دولت و ریاست کا مذاق اڑایا ہے، اپنی طرف سے تحریک عقد کر کے ہمارے رسوم و قوانین کی تذلیل کی ہے، اور ایک غیر مذہب کے مرد سے عقد کر کے ہمارے عقائد و نظریات کی توہین کی ہے۔" عقد کے بعد جیسے جیسے مرسل اعظمؐ کے نظریات سامنے آتے گئے مخالفتوں کا رخ خدیجہ کی طرف تیز تر ہوتا گیا، اب مکہ کی گلیوں میں صرف پیغمبر پر پتھر نہیں پڑ رہے تھے، نبیؐ کے ساتھ مخالفت و بغاوت کی

چکی ہیں سب گھر والے بھی پس رہے تھے، اور دنیا جانتی ہے کہ عورتوں کا مزاج زیادہ جذباتی ہوتا ہے اور وہ رسم و رواج کی زیادہ پابند ہوتی ہیں، عرب عورتوں کی نظر میں خدیجہ کا یہی ظلم کیا کم تھا کہ انھوں نے رسم و رواج کی مخالفت کی ہے اور ایک ایسے مرد سے عقد کیا ہے جو ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے، ان کی مخالفت کرتا ہے انھیں بے حس، بے جان اور بے مصرف کہتا ہے اور خدیجہ طلاق بھی نہیں لے لیتیں اور عقد سے نکل بھی نہیں آتیں بلکہ ان کی نصرت کر رہی ہیں، ان پر ایمان لے آئی ہیں، اور اپنی دولت سے ان کی امداد بھی کر رہی ہیں، اُن کے مذہب کو آگے بڑھا رہی ہیں اور سنا گیا ہے کہ ان کے شکم میں کوئی فرزند بھی ہے، یعنی ایک وارث کا بھی بند و بست ہو گیا ہے، غضب ہو گیا، قیامت آ گئی، کاش کوئی انھیں ختم کر دیتا کاش ایسی عورت سماج میں نہ پیدا ہوتی، کاش اسے موت آ گئی ہوتی کہ ہمارا مذہب نہ بدنام ہوتا، ہمارے قبیلہ کی ناک نہ کٹتی، خدا جانے یہ عورت کہاں سے آ گئی ؟ اور ابھی تک زندہ ہے۔ اب تو ایک ہی راستہ ہے کہ ولادت کے موقع پر سب اس کا بائیکاٹ کر دیں اور کوئی اس کے قریب نہ جائے ہمارے بتوں نے چاہا تو یہ تڑپ تڑپ کے مر جائے گی اور ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکون مل جائے گا۔

عورتوں کے مزاج سے جتنے سخت اقدام کی توقع کر سکتے ہوں، اسی روشنی میں حالات کا جائزہ لیجئے اور سوچئے کہ خدیجہ کا عالم کیا ہے اور کس طرح سارے سماج کی مخالفت کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ مگر اللہ رے صبر و ثبات کہ پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں، عقیدہ میں کوئی فرق نہیں، حمایت اسلام اور خدمت پیغمبر میں کوئی کوتاہی نہیں۔ اور دل آواز دے رہا ہے کہ حق کے جادہ پر ہوں تو خدا مددگار ہے، اس کے نبی کا ساتھ دیا ہے تو

وہ حفاظت کرنے والا ہے، اس کے مذہب کی راہ میں قربانی دی ہے تو وہ قدردان ہے۔
لیکن بشریت کہہ رہی ہے خدیجہ! جب ایسے وقت میں عورتیں نہ آئیں گی تو کیا ہوگا؟
جب کوئی مددگار نہ ملے گا تو کیا حشر ہوگا؟ کہ دفعتًا کانوں میں آواز آئی — اماں
گھبرائیے گا نہیں، اپنے ایمان پر ثابت قدم رہئے، خدا نگہبان ہے، خبردار!
کفار کی عورتوں سے مدد نہ لیجئے گا، پروردگار آپکی مدد کا انتظام کرے گا۔ خدیجہ
چونک پڑیں، یہ کس نے سہارا دیا ہے، یہ کس کی آواز آئی ہے، یہ دفعتًا دل کو سکون
کیوں حاصل ہوگیا ہے۔ مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے، مجھے فکر کرنے کی کیا
ضرورت ہے، مجھے تو یاد ہے کہ جب جناب فاطمہ بنت اسد پر یہ وقت پڑا تھا تو ان کے
پاس کوئی نہ تھا اور وہ خانۂ خدا میں تنہا تھیں تو جو خدا ان کے لئے انتظام کرسکتا ہے
وہی خدا میرے لئے بھی انتظام کرسکتا ہے، بلکہ عجب نہیں کہ یہ بھی مصلحتِ خدا ہو
کہ عرب کی عورتیں قریب نہ آئیں اور میری مدد کے لئے جنت سے حوریں آئیں
آسمان سے ہاجرہ، مریم، سارہ اور آسیہ آئیں اور سب مل کر میرا ہاتھ
بٹائیں، اور میں یہ سمجھوں کہ خدا کی طرف سے ہدایت کے ذمہ دار کی شان ہی کچھ
اور ہوتی ہے اور مجھے تو ایک انتظام قدرت یہ بھی نظر آرہا ہے کہ پروردگار!
میری لاڈلی کا رشتہ فاطمہؑ کے فرزند سے کرنا چاہتا ہے جبھی تو اپنے گھر میں
لڑکے کو پیدا کیا اور رسالت کے گھر میں لڑکی کو اتارا ہے۔ صلوات۔

عزیزانِ محترم! ہوا وہی جو خدیجہ نے سوچا تھا، حورانِ جنت آئیں
مریم و سارہ و حوّا و ہاجرہ آئیں اور صدیقہ طاہرہؑ کی ولادت باسعادت ہوئی،
وہ کتنی مبارک صبح تھی جب نبیؐ کے گھر مصداق کوثر آرہی تھی، خدیجہ کی گود
آباد ہو رہی تھی اور ابتر کا طعنہ دینے والے ابتر ہو رہے تھے، اسی توں کا

اندازہ کون کرسکتا ہے، امامت خوش تھی کہ امام آ گئی، اسلام خوش تھا کہ نگہبان آئی، عالم نسواں خوش تھا کہ راہنما آئی، جنت خوش تھی کہ خاتونِ جنت آئی، خدیجہ خوش تھیں کہ میری راحت جاں آئی، رسول اکرمؐ خوش تھے کہ میری نور نظر آئی، توحید خوش تھی کہ مباہلہ میں ہیکہ وقار کی محافظ آئی، قرآن خوش تھا کہ میری منزل تطہیر آئی۔ صلوات،

آئی اور کس شان سے آئی، فاطمہؑ بن کر آئی تو قوم کو جہنم سے نجات دلانے کا پیغام سنایا، بتول بن کے آئی تو آیت تطہیر کے لئے ایک عظیم مفہوم آیا، عذرا بن کے آئی تو طہارت کو ایک عظمت ملی، صدیقہ بن کے آئی تو صداقت کو ایک معیار اور مباہلہ کو ایک مصداق ملا، زہراؑ بن کے آئی تو دونوں عالم روشن اور منور ہو گئے، خاتونِ جنت بن کے آئی تو حورانِ جنت نے نثار ہونا شروع کر دیا اور درخت طوبیٰ نے سر تنچھاور کر دیے، سیدۃ النساء بن کے آئی تو عورتوں کو راہنما مل گیا، شریکۃ الرسولؐ بن کر آئی تو رسالت کو غمگسار مل گیا اور آمنہ کے انتقال کے بعد آئی تو ام ابیہا کا مصداق بن گئی۔ صلوات،

اتنے استحکام و اہتمام کے بعد یہ نہ سوچئے کہ اگر منصب رسالت و امامت نہیں ملا تو کردار میں کوئی کمی رہ گئی۔؟ نہیں! یہ بھی ایک مصلحت الٰہیہ ہے کہ اس نے فاطمہؑ کو منصب نہیں دیا۔ ورنہ فاطمہؑ کے کمالات و اوصاف میں کوئی کمی نہیں تھی، اور شاید وہ مصلحت یہ رہی ہو کہ اللہ نے باپ کو منصب رسالت سے نوازا، اور شوہر کو منصب امامت سے سرفراز کیا اور دنیا میں فاطمہ زہراؑ کو ہر منصب سے الگ رکھا۔ اس لئے اگر کبھی منصب میں جھگڑے پیدا ہوں اور لوگ منصب کے نام پر اختلاف کریں، منکر پیدا ہوں، مخالف پیدا ہوں، باغی پیدا ہوں، غاصب پیدا ہوں،

دشمن پیدا ہوں تو ایک معصوم کردار ایسا بھی رہے جو منصب کے جھگڑوں میں نہ پڑے اور اس کی عصمت ہر منصب دار کے کام آ سکے، چنانچہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب منصب نبوت پر وقت پڑا تو بھی فاطمہؑ ہی کام آئیں اور جب منصب امامت پر وقت پڑا تو اس وقت بھی فاطمہؑ ہی کام آئیں۔

دُنیا اس تاریخی حقیقت کو بُھلا نہیں سکتی کہ مباہلہ کے میدان میں رسالت پر وقت پڑا تو فاطمہ زہراؑ ہی گواہی کے لئے آئی تھیں اور فدک کے مسئلہ میں امامت پر وقت پڑا تھا تو فاطمہ زہراؑ ہی نے ترجمانی کی تھی اور دنیا پر واضح کر دیا کہ اختلاف منصب کا نہیں ہے یہ امت آیۂ تطہیر کو بھی بھلا چکی ہے اور جو امت اپنے نبیؐ کی بیٹی کی وفادار نہیں ہے وہ کسی اور کی وفادار نہیں ہو سکتی بسلوات،

ولادت کے بعد صدیقہ طاہرہ پانچ سال تک مادر گرامی کے ساتھ رہیں سنہ ۱۰ میں خدیجۃ الکبریٰ کا انتقال ہو گیا تو فاطمہؑ کی کفالت کی ذمہ داری جناب ام سلمہ کے سر آئی، مگر اللہ رے بلندئ کردار کہ خود جناب ام سلمہ کا بیان ہے کہ حضور اکرمؐ نے مجھے فاطمہؑ کو تربیت دینے کے لئے میرے حوالے کیا تھا لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے فاطمہؑ سے سیکھا ہے، فاطمہؑ کو سکھایا نہیں۔

یہ ایک غیر منصب دار کی شان ہے: کاش دنیا کو اب بھی ہوش آ جاتا کہ جب اس گھرانے کے غیر منصب دار تعلیم و تربیت کے محتاج نہیں ہیں تو منصب دار کیسے محتاج ہو جائیں گے؟ فاطمہؑ کے کردار نے رسالت کی عظمت کو بھی واضح کر دیا اور امامت کی جلالت پر بھی روشنی ڈال دی کہ یاد رکھو! میرے گھرانے میں نہ رسالت کسی کی محتاج ہے نہ امامت اور اس نکتہ کو کم از کم انھیں ضرور سمجھنا چاہئے،

جن سے میرا کوئی رشتہ ہے۔ البتہ اگر کوئی مجھ سے ہی تعلق نہیں رکھتا تو اس سے شکوہ بھی نہیں ہے۔ جو میرا نہ ہوگا وہ کسی اور کا ہوگا۔ صلوات۔

صدیقہ طاہرہ کے فضائل و کمالات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انسان کے فضائل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض فضائل اس کے اختیارات و اعمال و افعال سے پیدا ہوتے ہیں اور بعض کمالات خداداد ہوتے ہیں جن میں کسی انسان کو کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ کمالات پروردگار کیوں عطا کرتا ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر بحث کرنے کا محل نہیں ہے، ممکن ہے کہ یہ کمالات مستقبل کے پیش نظر دیئے جاتے ہوں اور یہ ظاہر کرنا ہو کہ یہ انسان مستقبل میں ایک عظیم منصب یا کمال کا حامل ہونے والا ہے، اس لئے ولادت ہی سے اسے غیر معمولی فضائل و کمالات کا حامل بنا دیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ بعض خصوصیات بر بنائے امتحان ہوں کہ ہم نے تجھے اس قدر کمالات عطا کئے ہیں اب دیکھنا ہے تو ان کمالات کی کہاں تک لاج رکھتا ہے، اور ان کے وقار کا کہاں تک تحفظ کرتا ہے؟

مثال کے طور پر انسانیت ایک شرافت و عزت ہے اور کسی انسان کا پروردگار پر حق نہیں تھا کہ اسے انسان ہی بنایا جاتا، اس کے اختیار میں تھا کہ وہ چاہتا تو انسان بناتا اور چاہتا تو جانور بنا دیتا۔ یہ اس کے کرم کی بات ہے کہ اس نے انسان کو انسان ہی پیدا کیا اور اسے پیدائشی طور پر عقل و ادراک فکر و نظر، قلب و دماغ، شعور و تعقل کی دولت سے سرفراز کر دیا، اب یہ اس کے اختیار کی بات ہے کہ چاہے ان جواہرات کی قدر کرے اور اپنی انسانیت کا کا تحفظ کر کے کرامت و شرافت کا تاج اپنے سر پر رکھ لے یا انھیں خاک میں

بلادے اور خود بھی حیوان سے بدتر بن جائے، ہم نے تاریخ میں دونوں طرح کے انسان دیکھے ہیں، وہ انسان بھی دیکھے ہیں جنھوں نے انسانیت کا اس قدر خون کیا کہ آخر کار جانور ہونے کی تمنا کرنے لگے، کاش میں جانور ہوتا، کاش میں حیوان ہوتا، کاش میں چڑیا ہوتا، اور ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جنھوں نے جوہر آدمیت کو اتنا بلند کیا کہ مقابلہ پر آنے والے فرشتے بھی دروازہ کے بھکاری بن گئے۔ کوئی کپڑے لئے چلا آ رہا ہے، کوئی کھانا لئے چلا آ رہا ہے، کوئی جھولا جھلا رہا ہے، کوئی چکی پیس رہا ہے، کوئی سلام کرنے آ رہا ہے، کوئی روٹی مانگنے آ رہا ہے، کوئی آیت لا رہا ہے، کوئی انگوٹھی لئے جا رہا ہے۔ صلوات،

مقصد یہ ہے کہ پیدائشی کمالات میں دونوں قسم کے احتمالات پائے جاتے ہیں، امتحان بھی ہو سکتا ہے اور احترام بھی، لیکن انسانیت کے مشترکہ صفات کے علاوہ کوئی کمال اسی وقت دیا جاتا ہے جب انسان میں کوئی خصوصیت پائی جاتی ہو اور قدرت کو اس سے کوئی مخصوص کام لینا ہو ورنہ عدالت پروردگار پر حرف آئے گا۔ علمائے اسلام نے آباء و اجداد پیغمبر کی شرافت و جلالت کی شرط اسی لئے لگائی ہے کہ مذہب الٰہی کا ذمہ دار اور منصب الٰہی کا ورثہ دار کوئی پست و ذلیل انسان نہیں ہو سکتا، ورنہ عہدہ بھی بدنام ہو جائے گا اور مقصد بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

اس تمہید کی روشنی میں آل محمدؐ کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ہر ایک کے یہاں مخصوص امتیازات و خصوصیات نظر آئیں گے۔ اس وقت صرف معصومۂ عالمؑ کے خصوصیات پر روشنی ڈالنا ہے اور مختصر لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اللہ نے صدیقہ طاہرہؑ کو ابتدا ہی سے ایسے کمالات و فضائل عنایت کئے تھے جو کائنات

کی کسی خاتون کو نہیں ملے، نسب و خاندان کے اعتبار سے باپ سیّد الانبیاء، ماں ملیکۃ العرب، بیٹے سرداران جوانان اہل جنّت، بیٹیاں محافظ اسلام کی بے سپاہ محافظ اور شوہر ایسا جس کے ایک چہرہ میں آدمؑ کا علم، نوحؑ کا زہد، ابراہیمؑ کی خلّت، موسیٰؑ کی ہیبت، عیسیٰؑ کا تقویٰ سب سمٹ آئے ۔ گویا ایک نقطہ ہے جس میں سارا قرآن سمٹا ہوا ہے۔ صلوات،

حالات کے اعتبار سے یہ امتیاز ہے کہ پیدا ہوئیں تو خاتم المرسلینؐ کے گھر، خدمت کے لئے آئیں تو حوران جنّت، پاسبان کا فرض انجام دیا تو مریم و حوّا اور ہاجرہ و آسیہ نے، دربانی کے لئے آئے تو آسمان کے ملک، سجدہ کرنے کے لئے آیا تو ستارہ زہرا، کپڑے لایا تو رضوان جنّت، آسیہ گردانی کے لئے آئے تو روح الامین اور سلام کرنے آئے تو رحمتؐ للعالمین، صلوات،

جسمانی اعتبار سے بھی سر وہ جس کی بلندی کو کوئی پا نہ سکے، ہاتھ وہ جن کے کرم پر ہل اتیٰ قربان، قدم وہ جن کی رفتار، رسول اللہ کی رفتار، زبان وہ جس کا انداز رسول اکرمؐ کا انداز، نگاہ وہ جس کے تیور باپ کے تیور، لہجہ وہ جس کی جھنکار شوہر کی ذوالفقار، گھر میں بیٹھ جائیں تو صلح خاتم النبیینؐ کا نمونہ، دربار میں آجائیں تو فاتح خیبر کی ترجمان، چادر اوڑھ کے لیٹ جائیں تو آیت تطہیر نازل ہو جائے، نقاب ڈال کر بیت الشرفؑ سے باہر آجائیں تو مباہلہ کا میدان سر ہو جائے، بزم رسالت میں آجائیں تو بنیمبرؐ تعظیم کے لئے اٹھ جائیں، دربار حکومت میں آجائیں تو چہروں سے نقابیں الٹ جائیں۔ صلوات،

معنوی اعتبار سے تو کمالات کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، قرآن کی آیتیں گواہ کہ زہرا، صدیقہ، طاہرہ، معصومہ، راضیہ، مرضیہ اور مرکز عصمت ہیں، نبیؐ کے ارشادات گواہ کہ فاطمہؑ سردار خواتین جنت، بہترین نساء عالم، مرکز مرضئ پروردگار، محبوب ترین خلائق، انسانیت کے پیکر میں حور صفت، شفیعۂ محشر اور مالکۂ جنت ہے۔ اور مختصر یہ کہ ابوالبشر آدم بھی وہ نہیں جو فاطمہ زہراؑ ہیں۔ ان کی خلقت کا امتیاز یہ تھا کہ اللہ نے بغیر ماں باپ کے پیدا کیا تھا لیکن آسمان پر پیکر بنانے کے لئے مٹی زمین سے منگائی تھی اور سیدہ کا امتیاز یہ ہے کہ زمین پر تخلیق کے لئے سیب جنت آسمان سے فراہم کیا جاتا ہے۔

اب ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ آدم کا رخ کدھر ہے اور سیدہؑ کا رخ کدھر ہے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، خاک کا رخ زمین کی طرف ہوتا ہے اور نور کا رخ بلندی کی طرف ہوتا ہے۔ صلوات،

اور یہ باتیں میں کہتا تو شاید دنیا اعتبار نہ کرتی اور اسے عقلوں مبالغہ اور خطابت و شاعری کا نام دے دیتی لیکن اسے کیا کیا جائے کہ خود مرسل اعظمؐ یہی اعلان فرما گئے ہیں کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ نہ آدمؑ نہ غیر آدمؑ۔ آدم و غیر آدم کی وسعت دیکھئے، اور سیدہ کی عظمت کا اندازہ لگائیے۔ مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ نبیؐ و علیؑ کو چھوڑ کر انبیاء میں، اولیاء میں، مرسلین میں، صاحبان کتاب میں، صاحبان شریعت میں کوئی ایسا نہیں ہے جو فاطمہؑ کا جواب بن سکے۔ اور جب انبیاء جواب بننے سے قاصر ہیں تو حوا و سارہ و ہاجرہ و مریم و آسیہ کا کیا ذکر ہے! تھا ایک

معصوم کی شریک زندگی ہیں اور بس۔ سارا ایک معصوم کی زوجہ ہیں اور بس، آسیہ ایک نیک کردار خاتون ہیں اور بس، ہاجرہ ایک معصوم کی زوجہ ہیں اور ایک معصوم کی ماں ہیں اور بس، اور مریم ایک معصوم کی ماں ہیں اور بس لیکن سیدہ کونین فاطمہ زہراؑ کی عصمت ہر طرف سے حصار کئے ہوئے ہے، ردائے تطہیر پردہ کھینچے ہوئے ہے، طہارت طواف کر رہی ہے۔ عظمت آستانہ پر سجدہ ریز ہے، بلندی بھیک مانگ رہی ہے رفعتیں سلام کر رہی ہیں، جدھر دیکھئے جلالت کا پہرہ ہے، جدھر نظر اٹھائیے عصمت و عظمت کی پاسبانی ہے، باپ ہے تو سید المرسلینؐ اور معصوم، شوہر ہے تو سید الاوصیاء اور معصوم، بچے ہیں تو سردار جوانان اہل جنت اور معصوم، ایک ایک رشتہ کی عظمت گزشتہ خواتین کو مبارک اور ہر رشتہ کی عظمت فاطمہ زہراؑ کو مبارک۔

مریم از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
وز سہ نسبت فاطمہ زہراؑ عزیز

نعرۂ صلوات

اللھم صل علی محمد و آل محمد

تیسری مجلس — داستانِ عزیمت صدیقہ طاہرہؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِہِمْ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشاد جنابِ اقدس الٰہی ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے

کیا کہنا اس معبود کے کرم کا کہ اس نے ہدایت کی ذمہ داری جاہل و ناداں انسان پر نہیں ڈالی بلکہ یہ عظیم کام اپنے ہی ذمے لیا اور انسان کی ذمہ داری فقط یہ قرار دی کہ وہ مالک کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرے اور اسکے معین کئے ہوئے نظام کے مطابق زندگی گزارے اسی میں خیرِ دنیا بھی ہے اور فلاحِ آخرت بھی، مالک کا یہ کرم نہ ہوتا تو آج ایک مردِ مسلم بھی اسی طرح ٹھوکریں کھاتا پھرتا جس طرح دنیا کے دوسرے افراد ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ صبح و شام قوانین بنتے ہیں اور مرض گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ صاحبانِ فکر و نظر ہیں، اربابِ عقل و دانش ہیں، منتخبِ روزگار افراد ہیں، چاند کی سیر کرنے والے ہیں، مریخ پر کمند ڈالنے والے ہیں، سینۂ دریا کو چیرنے والے ہیں، بطنِ گیتی سے خزانے نکالنے والے ہیں، لیکن اپنی ہی زندگی کے اصول و قوانین سے بے خبر ہیں۔ دنیا کے بارے میں جو تجربہ کرتے ہیں کامیاب ہوتا ہے اور اپنے بارے میں جو قانون بناتے ہیں وہ ناکام ہو جاتا ہے صبح کا بنایا ہوا قانون شام کو بدل جاتا ہے اور شام کا بنایا ہوا قانون صبح کو تبدیل

ہو جاتا ہے اور یہ طے نہیں ہو پاتا کہ پہلا قانون زیادہ مناسب تھا یا دوسرا۔ یہ تو تجربہ ہی بتائے گا کہ کس میں زیادہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات دوسرے قانون کا تجربہ ہی واضح کرتا ہے کہ پہلا قانون زیادہ صحیح تھا اور انسان اسی کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

نظام زندگی کے تفصیلات میں جانے سے پہلے ایک معمولی سی مثال دنیا کے فیشن کی لے لیجئے۔ فیشن کے پرستار صبح و شام بدلتے ہیں اور ہر تبدیلی کے بعد یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ طرز عمل زیادہ مناسب اور عصری تقاضوں کے مطابق ہے، لیکن چند دنوں کے بعد جب اس کے عیوب و نقائص سامنے آجاتے ہیں تو اس سے بہتر فیشن ایجاد کر لیتے ہیں اور چند ہی دنوں کے بعد اس کا عیب بھی ظاہر ہو جاتا ہے، تو اب یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ پہلا ہی انداز زیادہ صالح اور مناسب تھا، آپ تجربہ کر لیں کہ انسان نے چند سال کے اندر کتنی مرتبہ انداز بدلے ہیں اور کس کس طرح اپنے نفس کو دھوکا دیا ہے۔ کبھی چست لباس اختیار کیا اور دنیا کے معاشی حالات کی ابتری کو دلیل بنایا اور کبھی ڈھیلا ڈھالا لباس اختیار کر کے یہ دلیل دی کہ چست لباس میں انسان کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے، اور دنیا کے حالات عمل چاہتے ہیں، کبھی درمیانی راستہ نکالا اور یہ دلیل دی کہ گذشتہ دونوں انداز کمزوریوں کے حامل تھے لہذا یہ طریقہ ایجاد کیا گیا ہے اور بعد میں پھر معاشی حالات یاد آگئے اور پہلے ہی انداز کی طرف پلٹ گیا۔ غرض کہ انسانی زندگی تغیرات کا مجموعہ ہے اور اس کی بدنصیبی یہ ہے کہ کسی تغیر کے بعد یہ نہیں سمجھ پاتا کہ یہی تغیر صحیح ہے اور اس کے پہلے کے جملہ قوانین و قواعد غلط تھے۔

الٰہی نظام اور دنیاوی دستور میں یہی فرق ہے کہ دنیاوی نظام حالات کو دیکھ کر بدلتا ہے اور الٰہی نظام ایک محدود وقت کے لئے معین ہوتا ہے اس میں تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ دنیا اپنے تغیر کو تجربہ کا نام دیتی ہے اور اسلام اپنے تغیر کو شریعت کا نام دیتا ہے۔ دنیا کے لئے یہ ممکن ہے کہ نئے تجربہ کے بعد پھر پرانے تجربہ کی طرف پلٹ جائے لیکن اسلام کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ شریعت آنے کے بعد تجربہ پھر پرانی شریعت کی طرف پلٹا دے اور اسی کو اولیٰ و انسب ثابت کر دے۔ یہاں نظام میں اتنی پختگی اور اصول میں اتنی درستگی ہے کہ پرانی شریعت کا نمائندہ ہزاروں سال بھی زندہ رہے تو نئے شریعت کے وارث کی اقتداء ہی کرے گا اس کا امام نہیں ہو سکتا۔ صلوات۔

انسان نے دین الٰہی کو چھوڑ کر یہ بدنصیبی اپنے ذمہ لی کہ اپنا نظام حیات خود معین کرے اور مسلمان کی کل خوش قسمتی یہی ہے کہ اس نے اس بارِ گراں کو اپنے ذمہ نہیں رکھا، بلکہ اپنے مالک کے حوالے کر دیا ہے۔ اسے یہ سوچنا ہی نہیں ہے کہ ہمارے لئے کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب، اس کی یہ ذمہ داری ہی نہیں ہے کہ ہمارے حق میں کیا اولیٰ ہے اور کیا غیر اولیٰ۔ ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم یہ دریافت کریں کہ ہمارے لئے کیا نظام بنا ہے اور ہمیں کس قانون پر عمل کرنا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ خوش نصیبی بھی انھیں مسلمانوں کا حصہ ہے جنھوں نے یہ کام پروردگار کے حوالے کیا ہے اور دین الٰہی میں اپنی دخل اندازی کو جائز نہیں کہا ورنہ ان مسلمانوں اور کافروں میں کوئی فرق نہیں ہے جنھوں نے دین الٰہی کو بھی اپنے خواہشات کا کھلونا بنا دیا ہے اور کمال بے شرمی سے اس اعلان پر فخر کیا ہے کہ ہم نے حلال محمدؐ کو حرام بنایا ہے اور حرام محمدؐ کو حلال بنایا ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں

کہ یہ حلال و حرام محمدؐ کے معنی ہی نہیں سمجھے اور ان کا یہی خیال تھا کہ اس طرح اختلاف صرف حضور سرورِ کائناتؐ سے ہوگا ورنہ روحِ اسلام سے باخبر ہوتے تو انہیں یہ اندازہ ہوتا کہ یہ خطاب پروردگار سے ہے اور پروردگار کا باغی دائرۂ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔

مالکِ کائنات کے اس کرم کا احساس اور بھی شدید تر ہو جاتا ہے جب صنفِ نسواں کی کمزوری پر نگاہ جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے قانون کا بار اس ضعیف و ناتواں مخلوق پر نہیں رکھا ورنہ جب دورِ قدیم کے ترقی یافتہ مردوں نے اپنی قانون سازی سے انسانیت کو یوں تباہ و برباد کر دیا ہے تو اگر یہ کام جذبات و خواہشات کی مجسمہ عورت کے ہاتھ میں ہوتا تو کائنات کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا اور روئے زمین پر کسی اور ہی قسم کے افراد آباد ہوتے۔ یہ مالک کا کرم تھا کہ اس نے مردوں کی طرح عورتوں کی ہدایت کی ذمہ داری بھی اپنے ہی ہاتھوں میں رکھی ہے اور آخری دور میں جب آخری شریعت آ رہی تھی تو یاسمان شریعت بنا کر ایک ایسی خاتون کو بھیجدیا جس کا کردار صبح قیامت تک عورتوں کے لئے مشعلِ راہ بنا رہے گا اور جسے دیکھ کر دنیا کی ساری خواتین اپنی زندگی کے اصول مرتب کرتی رہیں گی۔ اس کے کردار میں کوئی نقص نہ ہوگا، اس کی زندگی میں کوئی کمزوری نہ ہوگی، آیتِ تطہیرؔ اس کی طہارت کی ضمانت لے گی، آیتِ مباہلہؔ اس کی صداقت کا اعلان کرے گی۔ آیتِ مودت اس کی قرابت کا اظہار کرے گی۔ سورہ دہرؔ اس کی سخاوت کا قصیدہ پڑھے گا گھر میں رہے گی تو ملک پاسبانی کے لئے آئیں گے، حوریں خدمت کے لئے آئیں گی، رضوان درزی بن کے آئے گا، زہرا سجدہ کرتا نظر آئے گا، جبرئیل جھولا جھلانے آئیں گے، میکائیل چکی چلانے آئیں گے۔ اور گھر سے باہر میدانِ مباہلہ میں نکلے گی تو نبوت سینہ سپر بن جائے گا اور امامت پشت پناہی کا فریضہ

انجام دے گی بصلوات۔

گفتار کا وہ انداز کہ گویا رسولؐ بول رہے ہیں، رفتار کا وہ انداز ہے کہ باپ سے ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے، کرم کا وہ عالم کہ ماں کی روح خوش ہو جائے۔ ایثار کی وہ کیفیت کہ دینِ خدا شرمندۂ احسان ہو جائے اور مردوں کی ہدایت کے لئے تیرہ آئیں تو عورتوں کے لئے ایک ہی خاتون قیامت تک کے لئے کافی ہو جائے بصلوات"

اور جب تنہا پوری صنف کی ہدایت کی ذمہ دار ہو اور تیرہ مردوں کا فرض اکیلے ادا کرے تو ہر ایک کا انداز بھی ہونا چاہیئے۔ اور ہر ایک کے جمال وجلال کا پرتو بھی ہونا چاہیئے، اخلاق میں رسالت کا انداز ہو، ہمت و استقلال، علم، حلم صبر و شجاعت میں امامت کی شان نظر آئے، بولے تو علیؑ معلوم ہو، چپ رہے تو حسنؑ کا انداز پیدا ہو، اٹھ جائے تو حسینؑ کردار ہو، صبر کرے تو زین العابدینؑ کا حلم نظر آئے علم میں محمد باقرؑ کی شان ہو، صدق میں جعفر صادقؑ کا انداز ہو، قوت برداشت میں موسیٰ کاظمؑ کا رنگ ہو، تسلیم و رضا میں علی رضاؑ کا انداز ہو، تقویٰ تقیؑ جیسا ہو، طہارت نقیؑ جیسی ہو، جلال وغضب میں عسکریت پائی جاتی ہو اور ارشاد و ہدایت میں مہدویت کا انداز ہو۔

فاطمہ زہرا صلوات اللہ وسلام علیہا کی زندگی ایک ایسی ہی زندگی ہے، آپ کی ذاتِ گرامی بیٹی ہونے کے رشتہ سے وارثِ رسولؐ ہے، رفیقِ زندگی ہونے کے اعتبار سے شریکِ امامت ہے، اور ام الائمہ ہونے کے لحاظ سے ہر امام کے کمال و جمال کی آئینہ دار ہے، جو کچھ گیارہ اماموں کے کردار سے کل ظاہر ہونے والا ہے اس کا پرتو معصومۂ عالم کی زندگی میں آج ہی پایا جاتا ہے اور شاید یہی راز تھا کہ پروردگار نے بھی کساء کے نیچے زہراؑ کا تعارف کرایا تو سارے فرشتوں کا مرکز

بنا دیا، اور اولاد کی منزل میں "بنوھا" جمع کا صیغہ استعمال کر دیا تاکہ زہرا مجسلہ اوصاف و کمالات کی مصدر و مرکز قرار پا جائیں۔

آج مختصر لفظوں میں اسی معصومہ کونینؑ کی حیات و شخصیت پر روشنی ڈالنا ہے۔ اور یہ دیکھنا ہے کہ صدیقہ طاہرہؑ کی ذاتی شخصیت کیا ہے اور آپ کی خدماتِ دینی و مذہبی قوم و ملت اور دنیائے اسلام و ایمان میں کیا ہیں۔؟

زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ بعثت کے پانچویں سال اس دنیا میں تشریف لائیں، تقریباً دو برس کی عمر تھی کہ حیاتِ پیغمبر اسلام ایک تازہ ترین مصیبت سے دو چار ہوئی، آپ کو پریشان کرنے، آپ کی راہ میں کانٹے بچھانے والے آپکے سر پر کوڑا پھینکنے والے مشرکین نے یہ طے کیا کہ آپ کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ جبتک سماج سے آپ کا رشتہ منقطع نہ ہو جائے گا آپکے تبلیغی اثرات کو روکنا ممکن نہیں ہے، آپکا مذہب روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور آپکے کردار کی روشنی دلوں میں گھر کرتی جا رہی ہے۔ بائیکاٹ کا منصوبہ بنا جناب ابوطالب پورے خاندان کو لے کر ایک غار میں چلے گئے، تین سال تک "مقاطعہ" برقرار رہا۔ اور بنی ہاشم درخت کے پتے چباتے رہے۔ نہ کوئی پرسان حال تھا نہ ہمدرد، نہ کوئی ان کے ہاتھ سامان بیچنے والا تھا نہ ان کے حالِ زار پر رحم کھانے والا۔ بالآخر کفار کو خود اپنے مظالم کا احساس ہوا اور بندش ٹوٹ گئی۔ اربابِ دانش خود پہچان سکتے ہیں کہ بنی ہاشم کا صبر و استقلال کیا تھا؟ جہاں ظالم ظلم کرنے سے تھک گیا، مظلوم ظلم برداشت کرنے سے عاجز نہیں ہوا۔ اسی بندش کی روشنی میں صفین کا فیصلہ بھی ہو سکتا ہے اور کربلا کا بھی، ظلم، جبر و تشدد ہی سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور مظلوم صبر و استقلال ہی سے مقابلہ کرتا ہے۔ تاریخ نے صاف واضح کر دیا کہ کفار و مشرکین کے ورثہ دار شام کے حکام ہیں

اور محمد مصطفٰےؐ کے وارث علیؑ بن ابی طالب اور حسینؑ بن علیؑ ہیں۔

پانچ سال کی عمر تھی جب یہ محاصرہ ٹوٹا، لیکن چند دنوں کے بعد ایک تازہ مصیبت آگئی کہ اُدھر جناب ابوطالب کا انتقال ہوا اور اِدھر ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ کمسنی میں یتیمی اور تنہائی کا صدمہ کیسا ہوتا ہے یہ زہراؑ ہی کا دل جانتا ہے، لیکن خدا رکھے ابھی باپ زندہ تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد حکم ہجرت آیا اور فاطمہؑ آٹھ برس کی عمر میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ آگئیں۔ نو برس کی عمر میں مولائے کائناتؑ سے عقد ہوا، دس برس کی عمر میں امام حسنؑ کی ولادت ہوئی، دوسرے سال امام حسین پیدا ہوئے، ایک سال کے بعد زینبؑ کی ولادت ہوئی اور اس کے دو سال کے بعد جناب ام کلثومؑ پیدا ہوئیں۔ اٹھارواں سال تھا جب شکم اقدس میں محسنؑ کی شہادت واقع ہوئی اور صدیقہ طاہرہؑ امت کے مظالم کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

اٹھارہ سال کی مختصر عمر اور اس میں مصائب کی یہ کثرت کہ خود اپنے حال کا مرثیہ پڑھا۔ مجھ پر اتنے مصائب ڈالے گئے کہ اگر دن پر پڑتے تو راتوں کی طرح تاریک ہو جاتے۔ لیکن کیا کہنا بنت رسولؐ کے صبر و استقلال کا کہ نہ ذاتی اوصاف و کمالات میں کوئی فرق آیا نہ خدمت مذہب و ملت سے انحراف فرمایا، قوم ستاتی رہی اور سیدہ ہدایت کی دعائیں دیتی رہیں۔ دنیا گھر جلاتی رہی اور فاطمہؑ فرض تبلیغ ادا کرتی رہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ نہ اس شان کا باپ دیکھا گیا نہ اس شان کی بیٹی، نہ اس کردار کا شوہر دیکھا ہے نہ اس عظمت کی زوجہ، نہ اس جلالت کے بچے دیکھے ہیں نہ اس رفعت و منزلت کی ماں۔ رشتوں کے ساتھ فضیلتیں سیدہ کے گھر کا طواف کر رہی تھیں اور نسبتوں کے ساتھ عظمتیں فاطمہؑ کی

ڈیوڑھی پر خیمہ ڈالے ہوئے ہیں۔

ذاتی فضائل کا یہ عالم تھا کہ مصلائے عبادت پر آ گئیں تو دنیا نورِ عبادت سے منور ہو گئی۔ صبح کے وقت ایک نور ساطع ہوتا، ظہر کے وقت دوسرا نور اور مغرب کے ہنگام تیسرا نور۔ مدینہ نورِ زہراؑ سے منور ہو جاتا اور فضیلت آواز دیتی۔ نماز پڑھ کر خود مقرب بارگاہ بن جانا امت کا کام ہے اور نماز سے کائنات کو منور کر دینا بنت رسولؐ کی منزل ہے صلوات۔

مساوات و مواسات کا یہ عالم تھا کہ گھر کا کام ایک دن فضہ انجام دیتی تھیں اور ایک دن خود بہ نفسِ نفیس۔ یعنی خانۂ زہراؑ میں ایک دن وہ بھی آتا جب کائنات کی شہزادی گھر کی خدمت کرتی تھی اور فضہ سکون سے بیٹھتی تھی۔ دنیا کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے کہ کوئی شہزادی اپنی خادمہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گی۔؟ ہرگز نہیں۔! میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ انداز یا علیؑ میں دیکھا ہے یا زہراؑ میں۔ وہاں قنبر نیا لباس پہنے اور خود بوسیدہ ردا اوڑھیں اور یہاں فضہ آرام کرے اور خود گھر کی خدمت کریں۔ کیا ایسا ماحول بھی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غلام و آقا کی تفریق کی جائے۔؟ اور کیا ایسا مولا پا کر بھی کوئی غلام و کنیز درِ آقا سے جدا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اور خدا گواہ ہے ہم نے بھی اسی کرم کو دیکھ کر غلامی کا دم بھرا ہے، اور ہمیں اعتماد ہے کہ ہم دنیا میں اپنی بدنفسی کی بنا پر غافل ہو جائیں تو ہو جائیں لیکن وہ قیامت کے دن اپنے کرم سے غافل نہ ہوں گے، جب ان کا دامن ہاتھ میں ہے تو جنت بھی اپنی ہے اور کوثر بھی اپنا ہے، خدا بھی اپنا ہے اور رسولؐ بھی اپنا ہے، اسلام بھی اپنا ہے، ایمان بھی اپنا ہے، کعبہ بھی اپنا ہے قرآن بھی اپنا ہے اور مختصر یہ ہے کہ ہم ان کے ہو گئے تو کل کائنات

اپناہے۔ صلوات،

کردار کی بلندی کو دیکھا تو یہ عالم نظر آیا کہ مرسلِ اعظمؐ نابینا صحابی کے ہمراہ بیٹی کے گھر آتے ہیں۔ دروازہ پر رک کر اجازت مانگتے ہیں۔ بیٹی نے عرض کی، بابا! یہ گھر آپ کا گھر ہے اور یہ سیدہ آپ کی خادمہ ہے، اجازت کا کیا سوال ہے؟

مرسلِ اعظمؐ نے پھر اجازت مانگی، سیدہ نے عرض کی۔ بابا! یہ آپ کیا فرمارہے ہیں۔؟ یہ گھر آپ کا گھر ہے، فرمایا۔ بیٹی! میرے ساتھ ایک نابینا صحابی بھی ہے۔ عرض کی بابا! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میرے پاس ایک چادر ہے سر چھپاتی ہوں تو پیر کھل جاتے ہیں، پیروں کو ڈھانکتی ہوں تو سر کھل جاتا ہے کیسے اجازت دوں؟

جی چاہتا ہے عرض کروں، بی بی! وہ صحابی نابینا ہے، آجانے دیجئے۔! سیدہ فرمائیں گی، صحابی نابینا ہے میں تو نابینا نہیں ہوں! میں یہ پسند نہیں کرتی کہ میری نگاہ نامحرم کے چہرے پر پڑے اور اسی حقیقت کا اعلان اس وقت کیا تھا جب پیغمبرِ اسلامؐ نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ عورت کے لئے سب سے بہتر شے کیا ہے؟ اور لوگ جواب کی منزل میں لباس، زیور، آرائش، آسائش کے بارے میں سوچ رہے تھے اور مولائے کائنات بیت الشرف میں آئے تھے تو سیدہ نے عرض کی تھی یا ابا الحسن بابا سے کہہ دیجئے کہ عورت کے لئے سب سے بہتر شے یہ ہے کہ نہ اس کی نگاہ نامحرم پر پڑے اور نہ نامحرم کی نگاہ اس پر پڑے۔ اور پیغمبرؐ نے یہ جواب سُنکر بیٹی کو گلے سے لگالیا تھا۔ بے شک رسولؐ کی بیٹی کا کردار ایسا ہی ہونا چاہئے۔ میں کہوں گا شہزادی! آپ کے بلند کردار

سے قربان لیکن بی بی! آپ تو معصومہ ہیں، آپ کے یہاں یہ امکان کہاں ہے کہ آپ کی نگاہ کسی نامحرم پر پڑ جائے، آپ نابینا صحابی کو آجانے دیجئے! عجیب نہیں شہزادی فرمائیں۔ بیشک، میرا کردار ایسا ہی ہے لیکن میں امت کے لئے ایک درسِ ہدایت اور نمونۂ عمل فراہم کر رہی ہوں اور دنیا کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ جب اس منزل کردار کو سوچ بھی نہ سکیں وہ تم ہو اور جو اس منزلِ کردار پر فائز ہو وہ نبی کی بیٹی فاطمہ زہراؑ ہے۔

اس مقام پر مجھے ایک واقعہ اور یاد آتا ہے کہ صحیح ترمذی کی روایت کے مطابق اسی انداز سے ایک مرتبہ رسول اکرمؐ اپنی ایک زوجہ کے گھر آئے تھے اور جب زوجہ نے بکمالِ مسرت داخلہ کی اجازت دیدی تھی تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرے ساتھ میرا ایک نابینا صحابی بھی ہے، تو زوجہ نے کہا تھا، کوئی مضائقہ نہیں ہے وہ تو نابینا ہے۔

مجھے کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے، واقعات دونوں آپکی نگاہ کے سامنے ہیں، اب اگر کردار کا فرق سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ بیٹی معصومہ ہے اور کہہ رہی ہے کہ بابا! وہ نابینا ہے، میں تو نابینا نہیں ہوں، اور زوجہ غیر معصومہ ہے اور کہہ رہی ہے کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یعنی جس منزلِ عصمت پر رسولؐ کی دختر فائز تھی، وہ منزلِ عصمت زوجہ کے تصور میں بھی نہیں تھی، اور دنیا جانتی ہے کہ عمل ہمیشہ تصور و تصدیق کے بعد ہوتا ہے، جس کا تصور ہی ذہن میں نہیں ہے، اس پر انسان عمل کیوں کر سکتا ہے؟ دخترِ پیغمبرؐ آواز دے رہی ہے۔ مسلمانو! اب مدینے کردار کی بلندی کو پہچانو کہ میں جس منزلِ عصمت پر فائز ہوں وہاں

دُنیا کی خواتین کا ذہن بھی نہیں پہنچ سکتا۔ کتنی گہری مناسبت ہے زوجہ اور شوہر کے کردار میں۔ زوجہ کا اعلان ہے کہ جہاں میری منزل ہے وہاں تک کسی عورت کا ذہن نہیں پہنچ سکتا، شوہر کا اعلان ہے کہ جہاں میری بلندی ہے وہاں تک کسی کا طائرِ وہم و خیال پرواز نہیں کر سکتا۔ صلوات۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ خواتین کا کیا ذکر ہے۔ فاطمہؑ اس منزلِ کمال پر ہیں جہاں مرسلِ اعظمؐ فرماتے ہیں کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی زہراؑ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ نہ آدم اور نہ غیر آدم۔ اور حبیب اللہ کے معصوم انبیاء زہراؑ کا مقابلہ نہ کر سکے تو امت کے گنہگار افراد کیا مقابلہ کریں گے اور جس کی زوجہ کا مقابلہ ممکن نہ ہو گا اس علیؑ سے کوئی کیا مقابلہ کرے گا۔ صلوات۔

قدرت کو یہی ادائیں اور یہی ذمہ دارانہ انداز پسند آیا کہ زہراؑ کی ہر خاطر کا خیال زمین سے آسمان تک رکھا گیا۔

عید کے موقع پر بچے مچل گئے، اور ماں نے کہہ دیا کہ بچو! سو جاؤ تمہارے کپڑے درزی کے یہاں ہیں۔ اور بچے بہ اطمینان سو گئے، ابھی تھوڑی دیر بھی نہیں گزری تھی کہ کسی نے آواز دی۔ بچو! کپڑے لے جاؤ۔ پوچھا گیا کون ہے؟ آنے والے نے جواب دیا۔ "میں حسنینؑ کا درزی ہوں، بچوں کیلئے کپڑے لیکر آیا ہوں۔"

آپ نے پہچانا یہ کون تھا۔؟ یہ رضوانِ جنت تھا جو حسنینؑ کا درزی بن کر آیا تھا، اور بچوں کے لئے جنت سے کپڑے لایا تھا۔ میں کہوں گا رضوان! تو نے اچھا کیا کہ کپڑے لے آیا، زہراؑ کی بات بھی رہ گئی اور بچوں کی عید کا سامان بھی ہو گیا۔ لیکن رضوان تیری عصمت خطرے میں پڑ گئی، معصوم جھوٹ نہیں بولتا اور تو فرشتہ ہو کر اپنے کو درزی کہہ رہا ہے۔ اللہ نے تجھے رضوانِ جنت بنایا ہے تجھے

اپنے کو رضوان کہنا چاہیے تھا، اس طرح تیری عصمت بھی محفوظ رہتی اور زہراؑ کا وقار بھی دوبالا ہو جاتا، کہ رضوانِ جنّت کپڑے لے کر آیا ہے لیکن جب تو نے اپنی حقیقت ظاہر نہیں کی تو ممکن ہے کہ اہلِ دنیا یہی سوچیں کہ کسی درزی کے یہاں کپڑے رہے ہوں گے اور وہی لایا ہوگا۔ رضوان آواز دے گا۔ یہ سب صحیح ہے لیکن میں اپنی حیثیت تم سے بہتر جانتا ہوں، تم کیا چاہتے ہو کہ میں بھی اپنا حشر فطرس جیسا کر لوں؟۔ یاد رکھو کہ میں انسان نہیں ہوں کہ اپنی حد سے آگے بڑھ جاؤں میں فرشتہ ہوں، اپنی منزل خوب پہچانتا ہوں، میں رضوان جنّت ہوں ٹھیک رضوانِ جنّت ہوں اور میری منزل بہت بلند ہے لیکن کاش تم نے یہ بھی سوچا ہوتا کہ رضوانِ جنت باشندوں کے لئے اہمیت رکھتا ہے، سرداروں کے لئے ایک خادم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، حسنینؑ جنّت کے سردار ہیں انکے مقابلہ میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے اور تمھیں سمجھا دیا ہے کہ رضوان جنت تمھارے سامنے آتا ہے تو رضوان ہوتا ہے اور حسنینؑ کی بارگاہ میں جاتا ہے تو درزی بن جاتا ہے۔

عزیزانِ محترم! یہ ہے جناب سیدہؑ کی عظمت اور یہ ہے فاطمہ زہراؑ کے بیان کی اہمیت کہ اگر بچوں کی تسکین کے لئے بھی کوئی فقرہ کہہ دیں تو جنّت کھنچکر روئے زمیں پر آجائے۔ اب کوئی اس زہراؑ کی عظمت کو پہنچے جسکے در کی یہ بلندی ہے کو سلام کرنے کے لئے نبیؐ آتے ہیں، کپڑے دینے کے لئے رضوان آتا ہے، خدمت کرنے کے لئے جبرئیل آتا ہے اور سجدہ کرنے کے لئے ستارہ زہرہ آتا ہے۔

معصومۂ عالمؑ کی زندگی کا وہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ مولائے کائناتؑ کے شدید اصرار پر آپ نے ایک انار کی فرمائش کی ..... اور مولاؑ انار لے کر چلے تو راستہ میں ایک غریب مریض کو دیکھا، اس نے انار کھانے کی فرمائش کی اور آپ نے انار اسے کھلا دیا، اور گھر کی طرف اس عالم میں چلے کہ سر جھکا ہوا ہے۔ بنت رسولؐ نے میرے اصرار پر ایک فرمائش کی تھی اور میں اسے پورا نہ کر سکا، دل کو یہ سکون ضرور تھا کہ سیّدہؑ واقعہ کو سنیں گی تو خوش ہونگی، سیّدہؑ کا مزاج خود بھی یہی ہے۔ بنت رسولؐ کا تو یہ عالم ہے کہ باپ کے گھر سے شادی میں ایک لباس ملا تھا اور جب خود ہی کسی سائل نے آکر سوال کر لیا تو وہ لباس بھی اتار کر دے دیا۔ بھلا سیّدہؑ کے ناراض ہونے کا کیا سوال ہے اور یہاں شکوہ کی کیا گنجائش ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ میں تو بنت رسولؐ کی فرمائش کو پورا نہ کر سکا۔ میں تو انار نہ لا سکا۔ یہ سوچتے ہوئے در سیّدہؑ کی طرف چلے۔ اُدھر جبرئیل امین طبق انار لیکر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اے حضورؐ! اسے علیؑ کے آنے سے پہلے یہ انار سیّدہؑ کے گھر تک پہنچا دیجئے۔ آپکی بیٹی نے فرمائش کی تھی، علیؑ نے انار سائل کے حوالے کر دیا۔ پیغمبرؐ نے انار سلمان کے حوالے کئے، سلمان در سیّدہ پر لائے، معصومۂ عالمؑ نے پوچھا: سلمان! یہ انار کہاں سے لائے؟ عرض کی۔ آپ کے بابا نے بھیجے ہیں۔ فرمایا: "بابا نے کیوں بھیجے ہیں؟" عرض کی۔ جبرئیل امین لائے ہیں۔ آپ نے مولائے کائناتؑ سے فرمائش کی تھی، انھوں نے انار لیا لیکن غریب سائل کے حوالے کر دیا، اللہ نے اس کے صلے میں یہ انار بھیجے ہیں کہ آپ کو انار بھی مل جائے اور علیؑ کی بات بھی رہ جائے۔ صلوات،

معصومۂ عالمؑ کی خوشی کا عالم نہ پوچھئے، اُدھر مولائے کائنات بیت الشرف میں داخل ہوئے، سر جھکائے ہوئے۔ فرمایا۔ بنت رسولؐ! یہ انار کی خوشبو کہاں سے

آ رہا ہے۔؟ عرض کی۔ ابا الحسن! یہ آپ ہی نے تو بھیجے ہیں۔ آپ نے انار سائل کے حوالے کر دیئے اور پروردگار نے جنت سے انار بھیج دیئے۔ اللہ رے اخلاص علیؑ، جو عمل کیا وہ خدا کو پسند آیا، جو ایثار کیا وہ راہِ خدا میں مقبول ہوا، انگوٹھی دی تو آیت آ گئی۔ انار دیا تو طبقِ جنت آ گیا۔ روٹیاں دیں تو سورۂ ہل اتیٰ آ گیا مال دیا تو انفاق و ایثار کا قصیدہ پڑھا گیا اور جان دی تو مرضیٔ پروردگار کا سودا کر لیا یعنی ساوات۔

معصومۂ عالمؑ کی حیات میں ایسے بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں جن سے آپ کی عظمتِ کردار پر روشنی پڑتی ہے لیکن تمام واقعات کا بیان کرنا مقصود نہیں۔ صرف خدمات کے سلسلے میں چند فقرے عرض کر کے بیان کو آخری منزل تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔

دنیا یہ سوچتی ہے کہ ایک عورت کسی مذہب کی کیا خدمت کر سکتی ہے اور اس کے امکان ہی میں کیا ہے۔؟ پھر عورت بھی اگر سیدہ عالمؑ جیسی خاتون ہو کہ گھر سے باہر قدم نکالنا ممکن نہ ہو۔ قوم و ملت کی خدمت کے لئے میدانِ عمل میں آنا پڑتا ہے، گھر میں رہ کر کوئی خدمت نہیں کی جا سکتی لیکن اربابِ کرم! معصومۂ عالمؑ نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ ایک عورت اپنے دائرۂ عمل میں رہ کر بھی بہت کچھ خدمت انجام دے سکتی ہے عورت کا کام سرِ بازار گھومنا نہیں ہے، عورت کا کام خدمتِ خانہ ہے اس کا میدانِ عمل گھر کی چہار دیواری ہے۔ ایک عورت اپنی تربیت سے صالح نسل پیدا کرے تو وہ ان لاکھوں عورتوں سے بہتر ہے جو خود میدانِ عمل میں رہتی ہیں اور بچوں کی تربیت سے یوں غافل ہو جاتی ہیں کہ

جتنا انھوں نے بنایا ہے سب اولاد نے تباہ کر دیا ہے۔ سیدۂ عالمؑ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں نے گھر کے اندر رہ کر وہ نسل کائنات کے حوالے کی ہے جس کا کوئی جواب آج تک نہیں پیدا ہو سکا ہے۔ بچے معصوم اور امام تھے تو وہ بھی جانِ کائنات تھے۔ اور غیر معصوم تھے تو وہ بھی سورج عالم تھے، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب معصوم بیٹے نے دین کو بچا لیا تو میری نورِ نظر زینبؑ نے میرے فرزند کے مقصد کا تحفظ کیا۔ میری صالح اور صحت مند تربیت نہ ہوتی تو ہجومِ مصائب میں میری بیٹی بھی ہوش کھو بیٹھتی لیکن یہ میری آغوش کا اثر تھا کہ مصائب بڑھتے گئے اور زینبؑ کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میری خدمات کا جائزہ لینا ہے تو دیکھو کہ میری ماں عرب کی سب سے بڑی مالدار خاتون تھی اور میں نے زندگی بھر فاقے کئے۔ ہم نے امت کی پرورش کو ضروری سمجھا ہے اور اپنے لئے فاقے ہی مناسب سمجھے ہیں۔

ماں کے انتقال کے بعد یتیمی کا صدمہ رہا لیکن صبر و استقلال میں فرق نہیں آیا اور باپ کی یوں خدمت کی کہ بابا نے مجھے اپنی ماں کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ یعنی جیسے باپ کو بیٹی کی محبت ملی ہے تو مجھ سے اور ماں کی الفت ملی ہے تو مجھ کر میں بیک وقت آمنہؑ بھی ہوں اور فاطمہؑ بھی۔ اس رشتے کو تم نہ سمجھو گے، اسے مرسلِ اعظمؐ سمجھتے ہیں۔ تم تو ابوطالبؑ اور بنت اسدؑ ہی کا احسان نہ سمجھ سکے تو میرا احسان کیا سمجھو گے۔"

بابا نے ہجرت فرمائی تو میں اسی گھر میں رہی جس میں علیؑ آرام فرما رہے تھے۔ یہ میرا کوئی معمولی ایثار نہ تھا کہ کمسنی کے عالم میں بھی میں نے کوئی فریاد نہیں کی۔ گھر گھرا رہا۔ تلواریں چمکتی رہیں، نیزے چمکتے رہے اور میں سکون و اطمینان کے ساتھ گھر میں بیٹھی رہی میری منزل کو یوں سمجھ لو کہ تصورِ ظلم کیا میں مظالم کو دیکھ کر بھی نہیں گھبرائی۔ میرا

صبر سکون اس منزل پر ہے کہ جہاں بڑے بڑے انسان ظلم سے ڈر کر رو دیا کرتے ہیں وہاں میں نفس مطمئن کا اظہار کرتی ہوں۔

مدینہ آکر عقد ہوا تو زندگی بھر شوہر سے کوئی فرمائش نہیں کی اور دنیا کی خواتین کو بتا دیا کہ شوہر سے فرمائش کرنا عورت کی کمزوری ہے اس کا کمال نہیں ہے اور ساتھ ساتھ مردوں کو بھی سمجھا دیا کہ میرے شوہر کی طرح گھر کا خیال رکھو، تاکہ زوجہ کو فرمائش کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

اُحد کا میدان آیا۔ میرا باپ زخمی ہو گیا، سارے مسلمان ساتھ چھوڑ کر چلے گئے لیکن باپ کی خدمت کے لئے میں پہنچ گئی اور میں نے زخم کی مرہم پٹی کی، کلمہ سب نے پڑھا تھا لیکن کام میرا ہی گھرانہ آیا۔ میدان میں دفاع میرے شوہر نے کیا اور گھر میں باپ کا علاج میں نے کیا۔

مباہلہ کے میدان میں عزتِ اسلام بچانے کے لئے میں ہی اپنے باپ، شوہر اور بچوں کے ساتھ گئی تھی، اسلام میں ہزاروں خواتین تھیں، خود میرے باپ کے گھر میں متعدد ازواج تھیں اور ایک سے ایک باکمال اور صاحبِ فضائل تھیں لیکن اسلام کے وقت پر میرے علاوہ کوئی کام نہیں آیا۔ وہ میں ہی تھی جو اس شان سے نکلی تھی کہ آگے آگے نبوت، پیچھے پیچھے امامت اور درمیان میں عصمتِ کبریٰ، منظر دیکھنے والے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ عصمت نبوت کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے اور امامت عصمتِ کبریٰ کے قدم پر قدم جمائے ہوئے ہے۔

حجتہ الوداع کے موقع پر بھی میں اپنے بابا کے ہمراہ تھی اور میں نے وہ منظر دیکھا ہے جب میرے شوہر کی ولایت کا اعلان ہو رہا تھا اور مسلمان اس ولایت پر مبارکباد دے رہے تھے اور اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے میں بابا کے انتقال

کے بعد دوبارہ حکومت میں آئی تھی اور میں نے اعلان کیا تھا کہ کل کے بیعت کرنے والے آج کے حاکم کس طرح بن گئے؟

میں نے ایک پوری صنف کو زندگی کا سلیقہ سکھایا ہے۔ بیٹی کا برتاؤ ماں باپ کے ساتھ، زوجہ کا برتاؤ شوہر کے ساتھ، ماں کا برتاؤ بچوں کے ساتھ، عزیز کا برتاؤ عزیز کے ساتھ، یہ سارے حقائق میرے کردار میں ملیں گے اور اس کی مثالیں نہ مریم کے کردار میں ملیں گی نہ سارہ کے کردار میں، نہ حوا کی زندگی میں ملیں گی نہ ہاجرہ کی زندگی میں۔ اور جب وہ پاکیزہ زندگیاں اتنی مثالوں کو پیش کرنے سے قاصر ہیں تو امت کی غیر معصوم عورتوں کا کیا ذکر ہے؟

لیکن چاہنے والو! اس دنیا نے میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا، یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ابھی میرے بابا کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ میری جاگیر پر قبضہ کر لیا گیا۔ میرے دروازے پر آگ اور لکڑیاں جمع کر دی گئیں اور مجھ سے کہا گیا کہ علی کو باہر نکالو، ورنہ گھر میں آگ لگا دی جائے گی، میں کہتی رہی کہ اس گھر میں رسولؐ کے چھوٹے چھوٹے نواسے حسنؑ و حسینؑ بھی ہیں، لیکن جواب ملا کہ ہم سب کو جلا دیا گے اور بالآخر مجبور وہ ظلم ہوا کہ میرا محسنؑ شہید ہو گیا، میرا پہلو شکستہ ہو گیا، میری پسلیاں ٹوٹ گئیں، میں خاک پر گر پڑی ——— اب جو ہوش آیا تو میں نے اپنے وارث کے گلے میں رسی دیکھی۔

آواز دی! ابوالحسنؑ کو چھوڑ دو، ورنہ سر کے بال پریشان کر دوں گی مسجد پیغمبر کی دیواریں بلند ہو گئیں، کائنات میں زلزلہ آ گیا، لیکن ظالموں نے

دل پہ کوئی اثر نہ ہوا۔

عزیزو! جب دربار میں گئی تو مجھے جھٹلایا گیا اور میرے گواہوں کو رد کر دیا گیا، میں نے باپ کے بعد صرف ۵، دن زندگی گزاری ہے لیکن یہ ۵، دن میرے لئے ۵، سال بن گئے اور میں مصلے پر بیٹھ کر دعا کرتی تھی کہ پروردگار اب مجھے دنیا سے اٹھا لے زہرا کو زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔

عزادارو! ایک لمحہ کے لئے سوچیو۔ کوئی ماں اپنے کمسن بچوں کو چھوڑ کر مرنا چاہتی ہے، کوئی خاتون اٹھارہ برس کی عمر میں موت کی تمنا کرتی ہے۔ کوئی عورت اپنے وارث کو ہجومِ مصائب میں روتا چھوڑ کر جانا چاہتی ہے لیکن ہائے مجھ پر وہ وقت پڑ گیا تھا کہ میری زبان پر دعائے موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پروردگار میں اس امت کے لئے بد دعا نہ کروں گی، میں اپنی ہی موت کی دعا کر رہی ہوں۔ آخر وہ وقت بھی آیا جب میری دعا قبول ہوگئی اور میں نے زندگی کے آخری لمحات میں اپنے بچوں کو نہلا دھلا کر مسجد کی طرف بھیج دیا اور حجرۂ عبادت میں جا کر مشغولِ بندگیٔ پروردگار ہوگئی۔ میں نے اسماء کو تاکید کر دی کہ میرے بچوں کا خیال رکھیں۔ میں نے ابوالحسنؑ سے وصیت کر دی کہ میرے کمسن بچوں کا خیال رکھیں۔ میں دنیا سے رخصت ہوئی تو سارے حقوق ادا کر کے گئی اور کوئی حق اپنے ذمہ لے کر نہیں گئی۔

جی چاہتا ہے عرض کروں، ہاں شہزادی آپ نے جملہ حقوق ادا کر دیئے لیکن بی بی! ایک لمحہ کے لئے مڑ کر دیکھئے آپ کے بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔ آپ تو دنیا سے رخصت ہوگئیں، ذرا حسنینؑ کی حالت تو دیکھئے، ذرا اپنی زینبؑ و ام کلثومؑ کا تڑپنا تو دیکھئے۔

عزادارو! زہراؑ سب کچھ دیکھ رہی تھیں، اور یہی وجہ ہے کہ جب علیؑ نے حسب وصیت غسل وکفن دے کر جنازہ تیار کیا اور بچوں کو آواز دی، بچو! آؤ ماں کا آخری دیدار کر لو۔ اور شہزادوں نے پائینتی کھڑے ہو کر ماں کو حسرت سے سلام کیا اور آواز دی۔ اماں! نانا سے ملاقات ہو تو ہمارا سلام کہئے گا اور کہئے گا ہم یتیم ہو گئے، ہم دنیا میں غریب ہو گئے۔ تو ایک مرتبہ بندِ کفن ٹوٹے، زہراؑ کے ہاتھ بڑھے، بچوں کو گلے سے لگا لیا، "ارے میرے بچو! میں سامنے موجود ہوں اور تم غربت کا نام لے رہے ہو مجھ سے یہ کیسے برداشت ہو سکے گا۔" مولائے کائناتؑ آگے بڑھے، بچوں کو لاش سے جدا کیا، سر پر دستِ شفقت پھیرا، میں کہوں گا۔ عزادارو! جب یتیموں کو لاش سے جدا کیا جاتا ہے تو اتنی ہی شفقت و محبت سے جدا کیا جاتا ہے۔ مگر ہائے سکینہ! باپ کی لاش، شمر کا تازیانہ، بچی کا نوحہ، زمینِ کربلا کا زلزلہ، زینب کی فریاد، کون تھا جو بچی کو تسکین دیتا، بھائی زنجیروں میں جکڑا ہوا، ماں رسن بستہ، ہر طرف دشمنوں کا ہجوم ہر چہار سمت نامحرموں کا مجمع، عجب نہیں لاشِ حسینؑ کو جنبش ہوئی ہو اور آواز آئی ہو۔ میری سکینہ، میری لال، صبر کر بیٹی صبر۔

عزادارو! میں اپنا بیان تمام کر دیتا لیکن ایک جملہ اور کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کس سے کہوں اور کیوں کر کہوں۔ آپ معصومۂ عالمؑ سے فریاد کریں، بی بی! آپ نے حسینؑ کی زبان سے غربت کا نام نہ سنا گیا، اب ذرا عصرِ عاشور کربلا میں آئیے۔ ہائے وہ عصر کا ہنگام، وہ حسینؑ کا آخری سجدہ، وہ شمر کا خنجر، وہ زمین کا زلزلہ، وہ آسمان سے خون کی بارش، وہ تیز آندھیاں، وہ آفتاب کا گہن اور وہ بلندی سے ایک بی بی کی فریاد۔ "پسرِ سعد میرا بھایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔" اور اس ہنگام میں وہ حسینؑ کا اشارہ۔ زینب! واپس جاؤ، ابھی بھائی زندہ ہے، حسرت

اپنے سامنے تمھیں خیمے کے باہر نہ دیکھ سکے گا:

میں کہوں گا مولا! بہن کو آجانے دیجئے، ابھی زینب کے سر پر چادر ہے۔ بہن بھائی سے رخصت ہوئے، مولا! تھوڑی دیر کے بعد کیا ہوگا۔ جب آپ کا سر تن سے جدا ہو جائے گا، خیموں میں آگ لگے گی، سیدانیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ کی طرف اور آخر میں جلتے خیموں سے اس شان سے باہر نکلیں گی کہ سر کے بال بکھرائے ہوئے، منھ پر طمانچے مارتی ہوئی ــــ وا محمداہ، وا علیاہ، وا حسیناہ،

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ

جنابؑ امام حسن علیہ السلام

اسم مبارک	:	حسنؑ ،
لقب	:	مجتبیٰ ، زکی ، وغیرہ ،
کنیت	:	ابو محمدؑ ،
والد ماجد	:	حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ ،
والدۂ ماجدہ	:	جناب فاطمہ زہراؑ ،
ولادت	:	۱۵ رمضان المبارک ۳ھ مدینہ منورہ ،
ازواج	:	کنیزوں سمیت ۶۴
اولاد	:	جناب قاسم ، حسن مثنیٰ ، عبداللہ وغیرہ ۱۵ سے ۲۲ تک
شہادت	:	۲۸ صفر ۵۰ھ مدینہ منورہ ،
عمر شریف	:	۴۷ سال ،
قبر مطہر	:	جنت البقیع ،

چوتھی محفل داستانِ عظمتِ امام حسن مجتبیٰؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء

والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد

وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین۔

اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشادِ جنابِ احدیت ہوتا ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

تاریخ انسانیت کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب مالکِ کائنات نے ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو اور عالم بشریت کی رہنمائی کے لئے کوئی نہ کوئی ہادی اور راہنما نہ معین کیا ہو۔ تاریخ خود گواہ ہے کہ اس نے ضرورت و حالات کے مطابق ایک ایک دور میں متعدد ہادی اور راہنما بھی معین کئے ہیں اور کوئی قریہ، کوئی شہر، کوئی بستی ایسی نہیں چھوڑی جہاں اپنا ہادی اور راہنما نہ بھیجا ہو۔ تفصیلات ملیں یا نہ ملیں قرآن مجید خود گواہ ہے کہ ایک ایک وقت میں متعدد راہنما رہے ہیں اور اپنے اپنے علاقہ میں ہدایت کا فرض انجام دیتے رہے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی علاقہ میں متعدد راہنما بھیجے گئے۔ اگر قوم ایک کی آواز کو ہوا میں اڑا دینا چاہے تو دوسرا تائید کرنے کے لئے موجود ہے۔ جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ کا واقعہ کسے نہیں معلوم کہ پروردگارِ عالم نے فرعون کی ہدایت کے لئے دونوں کو ایک ساتھ بھیجا، اور موسیٰؑ نے خود بھی یہ مطالبہ کیا کہ پروردگار میرے بھائی ہارونؑ کو میرا وزیر بنا کر

میری پشت مضبوط کرے، حیرت کی بات ہے کہ موسیٰ نبی ہیں اور ہارون ان کے وصی، نبی اپنے وجود کو ہدایت کی منزل میں ناکافی سمجھ رہا ہے اور ایک وزیر کی ضرورت محسوس کر رہا ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ میں وہ انقلاب آیا کہ نبی کے اٹھتے ہی کتاب کافی ہو گئی اور نبی کے وزیر کی ضرورت نہ رہی۔

کاش کوئی ہوتا جو موسیٰ سے کہتا۔ نبی خدا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں ایک نبی کے لئے باعث توہین ہے کہ وہ منزلِ تبلیغ میں کسی وصی یا وزیر کی ضرورت محسوس کرے، آپ تشریف لے جائیں، اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ نبی کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ وصی و وزیر کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن جناب موسیٰ آواز دیں گے کہ انبیاء کی مصلحتوں کو تو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے ہم بہتر جانتے ہیں کہ کس وقت کس چیز کی ضرورت ہے؟ یہ تیرے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔

میں عرض کروں گا کیا کبھی نبوت پر بھی ایسا وقت آسکتا ہے، جب نبی وصی کے بغیر اپنے وجود کو ناکافی سمجھے اور وصی کے وجود کو اپنے وجود کی تکمیل قرار دے۔

یقیناً ایسا ہی ہے اور ایسا نہ ہوتا تو دعوت ذوالعشیرہ میں مددگار کی جستجو نہ ہوتی اور نبی اکرمؐ اپنے اعتماد پر اعلانِ اسلام کر دیتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موسیٰ کو اپنے ہارونؑ کی ضرورت تھی اور پیغمبر اسلامؐ کو اپنے ہارونؑ کی ضرورت ہے اور اسی وجہ سے تو پیغمبرؐ نے کہدیا تھا یا علیؑ میرے اور تمہارے وہی نسبت ہے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کی تھی۔ فرق بس یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ہارونؑ کو مرتبہ نبوت بھی ملا تھا اور تم نبی نہ ہو گے۔ باقی جملہ ہارونی صفات و کمالات تمہارے اندر بطریق اولیٰ پائے جاتے ہیں۔ آپ اسے نقص اور کمزوری نہ سمجھیں، ہارونؑ کو

نبوت ضرور ملی لیکن موسیٰ کی زندگی ہی میں دنیا سے اٹھ گئے اور بعد بار موسیٰ کو اٹھانے کا ایک دن بھی نہ آیا اور علیؑ پیغمبر اسلامؐ کے بعد بھی زندہ رہے اور وصایت و وزارت کے رشتہ سے پورا کاروبار نبوت سنبھالے رہے، جب ہی تو پیغمبرؐ نے غدیر کے میدان میں اعلان کیا تھا کہ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا یہ علیؑ مولیٰ ہے۔ صلوات۔

موسیٰ اور ہارون کے رشتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ پروردگار عالم نے اس رشتہ کو اس قدر مضبوط بنا کر "برائے نام" بھی فرق نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ اس موقع کو یاد کریں جب ۳ھ کے وسط میں جناب ام الفضل نے یہ خواب دیکھا کہ رسول اکرمؐ کے جسم کا ایک ٹکڑا بدن اقدس سے جدا ہو کر میری گود میں آ گیا ہے اور گھبرا کر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضور! اس خواب کی تعبیر کیا ہے، مجھے تو بے حد وحشت محسوس ہو رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ام الفضل گھبراؤ نہیں، یہ وحشت کی منزل نہیں ہے، مسرت کی منزل ہے، عنقریب میری بیٹی فاطمہؑ کے یہاں ایک فرزند متولد ہونے والا ہے جو میرا پارۂ جسم و جگر ہوگا اور تمھاری آغوش میں رہے گا۔ ام الفضل مسرت سے جھوم اٹھیں اور وقت کا انتظار کرنے لگیں۔ یہ میرا مقدر کہ رسولؐ کا پارۂ جسم و جگر میری آغوش میں رہے۔ زہراؑ کا لال میری گود میں پرورش پائے۔

خدا کے فضل سے وہ وقت بھی آیا جب ۱۵ ماہ مبارک کی صبح کو صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے یہاں حسنؑ مجتبیٰ کی ولادت ہوئی۔ اور ام الفضل کو اپنے خواب کی تعبیر ملی۔ مسرت کا عالم نہ پوچھئے، ادھر زہراؑ خوش ادھر

ام الفضل خوش، ادھر اسماء خوش، ادھر سرورِ کائنات خوش، ادھر نفس اللہ خوش ادھر اللہ خوش۔ زمین سے آسمان تک خوشی کا عالم ہے۔ ملائکہ مبارکباد دینے کیلئے آرہے ہیں۔ حوریں وجد میں جھوم رہی ہیں۔ جنّت سجائی جارہی ہے۔ کوثر کا پانی فرطِ مسرّت سے موجیں مار رہا ہے۔ زہراؑ کو لاڈلا ملا، علیؑ کو وصی ملا۔ نبیؐ کو وارث ملا۔ قرآن کو مفسّر ملا۔ اسلام کو محافظ ملا۔ حرمِ خدا کو پاسبان ملا۔ دینِ الٰہی کو نگہبان ملا۔ ام الفضل کو تعبیر ملی۔ جنّت کو سردار ملا۔ جبریلؑ کو مخدوم ملا۔ عرشِ الٰہی کو گوشوارہ ملا۔ زمین کو زینت ملی۔ مدینہ کو رونق ملی۔ بیتِ رسالت کو جلالت ملی۔ امت کو مصلح ملا۔ اہلِ محبت کو مصداق اجرِ رسالت ملا۔ صلوات؛

اسماءؑ بچہ کو زرد کپڑے میں لپیٹ کر پیغمبرِ اقدس کی خدمت میں لائیں۔ حضورؐ فرزند مبارک ہو! سرکار نے ایک نظر غور سے دیکھا اور تیوریوں پر بل ڈال کر بولے۔ اسماءؑ یہ زرد کپڑے میں کیوں لپیٹا؟ میں نے منع کیا تھا کہ بچہ کو زرد کپڑے میں نہ لپیٹا جائے۔ اسماء دوڑ کر گئیں اور سفید کپڑے میں بچہ کو لپیٹ کر سرکارِ دو عالمؐ کی آغوش میں دیدیا۔ گویا جسم کو جان مل گئی، رحل کو قرآن مل گیا، پھول کو خوشبو مل گئی، گلستان کو باغبان مل گیا، طور کو جلوہ مل گیا، اور نور کو نور مل گیا۔ صلوات،

میں نہیں جانتا کہ حضورؐ نے رنگین کپڑے کی مخالفت کیوں کی اور بچہ کو سفید کپڑے میں لپیٹنا کیوں ضروری سمجھا۔ نبوت کی مصلحت نبوت ہی جانتی ہے۔ اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ شاید حضورؐ کا اشارہ اس بات کی طرف رہا ہو کہ میرے بچوں پر دنیا کا کوئی رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ یہ اللہ کے رنگ میں رنگ کر آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں رنگین کپڑوں کی ضرورت بھی ہوگی تو یہاں سے رنگ کام نہ آئیں گے بلکہ آسمان سے جبرئیل آئیں گے، کوثر سے پانی آئے گا۔ جنّت سے رنگ آئے گا اور

عید کے دن بچوں کے کپڑے رنگے جائیں گے۔

عزیزان محترم! اب آپ نے محسوس کیا کہ جن کے پاس پر دنیا کا رنگ نہ چڑھ سکے ان کے کردار پر دنیا کا رنگ کیا چڑھ سکتا ہے۔؟ صلوات۔

کتنے نادان ہیں وہ انسان جو کردار حسنؑ پر "خواہش پرستی" کا الزام لگا کر طلاق و نکاح کی داستانیں سناتے ہیں اور دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آل محمدؐ بھی معاذاللہ سماج کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ قدرت نے مختلف مواقع پر واضح کر دیا کہ دنیا کے رنگ سے متاثر ہونا تمہارا کام ہے اور ہمارے رنگ میں کردار کو رنگ لینا آل محمدؐ کی شان ہے۔ صلوات،

بچہ رسولؐ کی آغوش میں ہے، علیؑ نگاہ کے سامنے ہیں۔ ایک مرتبہ رسولؐ نے مڑ کر دیکھا۔ یا علیؑ اس بچہ کا کیا نام رکھا ہے؟۔ عرض کی۔ حضور یہ کام آپ کا ہے مجھ سے کیا تعلق۔ کیا میں آپ پر سبقت کر سکتا ہوں۔؟

رسول اعظمؐ نے مسرور ہو کر فرمایا۔

بے شک یا علیؑ! تم مجھ پر تقدم نہیں کر سکتے اور میں خدا پر تقدم نہیں کر سکتا، اس بچہ کا نام وہی معین کرے گا۔ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ جبرئیل امین نازل ہوئے۔ عرض کی یا رسول اللہ! ارشاد احدیت ہے کہ آپ میں اور علیؑ میں وہی نسبت ہے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ میں ہے، آپ علیؑ کے فرزند کا نام ہارون کے فرزند کے نام پر رکھدیں۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا۔ ہارون کے فرزند کا نام کیا ہے۔؟ عرض کی، شبّر۔ فرمایا۔ لیکن یہ تو عربی زبان کا نام نہیں ہے۔ عرض کی اس کا ترجمہ ہے حسنؑ۔

رسول اعظمؐ نے بچہ کا نام حسنؑ رکھدیا اور دنیا پر منزلت ہارونی سے

ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ ہمارے نام بھی آسمان سے نازل ہوتے ہیں تو ہمارے کمالات کا کیا ذکر ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ جب ہم برائے نام بھی دنیا کے محتاج نہیں ہیں تو منصب و کمالات میں کسی کے کیا محتاج ہوں گے۔ صلوات۔

نام طے ہو گیا۔ بظاہر خبر کا ترجمہ حسنؑ طے ہوا لیکن۔ باپ کرم! یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ترجمہ اصل سے زیادہ نیا نکلا۔ خبر تو ہارونؑ کے فرزند کا نام رہ چکا تھا لیکن حسنؑ تاریخ میں کسی کا نام نہیں ہوا تھا اور اسی لئے تاریخ کو اعتراف کرنا پڑا کہ حسنؑ و حسینؑ دونوں نام خزانۂ قدرت میں محفوظ تھے جنھیں پروردگارِ عالم نے اپنے نبیؐ کے نواسوں کے لئے محفوظ کر رکھا تھا۔

لفظ حسنؑ کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو کبھی عربوں کے ذہن میں نہ آیا ہو یا اس کا استعمال زبانِ عرب میں نہ ہوتا رہا ہو۔ یہ لفظ استعمال ہوا اور سیکڑوں مرتبہ سماج کی نظروں سے گزرا لیکن نہ جانے کیا مصلحت پروردگار تھی کہ کسی نے اپنے بچہ کا یہ نام نہیں رکھا اور سب اسے بطور صفت ہی استعمال کرتے رہے اور اس سے دنیا میں دافع ہو گئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آلِ محمدؐ کا کمال اس منزل پر ہے کہ جس لفظ کو دنیا بطور صفت استعمال کرتی ہے وہ ان کی منزل تک آتے آتے نام بن جاتا ہے صفت حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ انسان پہلے بچہ ہوتا ہے۔ پھر جوانی میں یہ صفت شباب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ضعیفی آتے آتے یہ صفت بھی رخصت ہو جاتی ہے اور اب بوڑھا کہا جاتا ہے لیکن نام وہی نام رہتا ہے جو پیدائش کے وقت رکھا گیا تھا۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی وہی نام رہ جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ حسنؑ عمل دکردار "حسنؑ" کی ذات سے یوں وابستہ

ہے کو بچے ہیں تو حسنؑ ہیں، جوان ہیں تو حسنؑ، ضعیف ہوں تو حسنؑ، خاموش رہیں تو حسنؑ، بول اٹھیں تو حسنؑ، جنگ کا ارادہ کریں تو حسنؑ، صلح کریں تو حسنؑ، حدیہ ہے کہ زندہ رہیں تو حسنؑ اور دنیا سے اُٹھ جائیں تو حسنؑ،

صلوات،

اس مقام پر ایک دُوسرا نکتہ یہ ہے کہ لفظ حسنؑ بار بار نگاہوں کے سامنے آیا لیکن یہ انتظام قدرت تھا کہ کوئی متوجہ نہ ہو سکا، گویا قدرت نے اشارہ کر دیا کہ ہم نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہیں تو شے سامنے آکر بھی اُوجھل ہی رہتی ہے اور ذہن متوجہ نہیں ہونے پاتے، اب سمجھئے فلسفۂ حیاتِ آلِ محمدؐ، ان کی غیبت اور ان کے ظہور کا معاملہ بھی عجیب ہے، یہ غیبت میں بھی ظاہر رہتے ہیں اور ظہور میں بھی غائب رہتے ہیں، ان کی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ محفل میں رہتے ہیں اور سوائے صاحبانِ ایمان کے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں اور صاحبانِ ایمان دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے ایمان و یقین کی بات ہے کہ ایمان نہیں ہوتا تو پہلا محمدؐ بھی سامنے سے نکل جاتا ہے اور کفار و مشرکین کو خبر نہیں ہوتی اور ایمان و یقین ہوتا ہے تو آخری محمدؐ بھی پردۂ غیب میں رہتا ہے اور دنیائے ایمان مسلسل زیارت کرتی رہتی ہے۔ صلوات،

نام کا ذکر آ گیا تو نام کے بارے میں بھی ایک لفظ عرض کرتا چلوں، دنیا میں نام کی کوئی اہمیت نہیں ہے، نام کردار سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا، آپ کسی کا کوئی نام رکھ دیجئے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کا کردار بھی ویسا ہی ہو، بلکہ بسا اوقات تو اس سے بالکل برعکس ہو جاتا ہے

بچہ جاہل پیدا ہوتا ہے اور نام عالم رکھا جاتا ہے۔ آدمی عاجز ہوتا ہے اور نام قادر رکھا جاتا ہے۔ کمالات کا دور دور پتہ نہیں ہوتا اور نام فاضل و کامل رکھا جاتا ہے۔ اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ نام فقط ایک علامت ہے اس کا کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر نام کردار کے خلاف بھی نکل جائے تو کوئی نام رکھنے والے سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ آپ نے ایسا نام کیوں رکھا آپ نے عالم کہا تھا اور یہ جاہل رہ گیا۔ آپ نے فاضل کہا تھا اور یہ بے فضل بلکہ فضول ہو گیا۔ نام رکھنے والا بھی یہی کہے گا کہ میں نے ایک علامت معین کر دی تھی، زندگی اور سیرت و کردار کی ضمانت نہیں لی تھی اور نہ مجھے مستقبل کے بارے میں ضمانت لینے کا حق تھا، اور جب نام کا مسئلہ اتنا آسان ہو تو نبوت کے گھرانے میں اتنا اہتمام کیوں برتا گیا ...... کہ زہراؑ، علیؑ پر سبقت نہ کریں، نبیؐ خدا پر سبقت نہ کریں اور خدا جبرئیل امین کے ذریعہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کی تاریخ دہرا کر ایک نام تجویز کرے۔ اتنے معمولی سے کام کے لئے اتنے بڑے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟۔ وہ کون سا کام ہے جو علیؑ نہ انجام دے سکتے ہیں۔ وہ کون سا کام ہے جو نبیؐ کے بس کا نہیں ہے کہ خدا بھی اس میں شامل ہو جائے تو مسئلہ حل ہو۔

عزیزانِ محترم! میں نہیں جانتا کہ مصلحت کیا ہے؟۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ نام بندے رکھتے ہیں تو مستقبل کی ضمانت نہیں ہوتی، وہ مستقبل کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور مستقبل ان کے اختیار میں نہیں ہوتا اور نام خدا رکھتا ہے تو مستقبل کی ضمانت بھی ہوتی ہے اور کردار کی علامت بھی اور یہی وجہ ہے کہ نبیؐ کا نام محمدؐ بھی اسی نے رکھا۔ علیؑ کا

ن بھی اسی نے رکھا، شہزادوں کا نام حسنؑ و حسینؑ بھی اسی نے رکھا، زہراؑ کا نام فاطمہؑ بھی اسی نے رکھا اور نام رکھ کر واضح کر دیا کہ جسے میں محمدؐ کہہ دوں وہ ہر حال میں قابل تعریف ہے۔ جسے میں علیؑ کہہ دوں وہ ہر حال میں بلند ہے۔ جسے میں فاطمہؑ کہہ دوں وہ محشر تک عذاب الٰہی سے بچانے والی ہے۔ جسے میں حسنؑ و حسینؑ کہہ دوں اس کے کردار میں حسن کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ صلوات،

یہ ضرور ہے کہ مستقبل کے حالات کا علم تو نبیؐ اور امامؑ کو بھی ہوتا ہے تو اس میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟ جب اس نے علم دے دیا تو اسی کی روشنی میں جو نام چاہیں متعین کر دیں۔ لیکن ارباب کرم! اولاً تو یہ مسئلہ نبیؐ ہی کے نام سے شروع ہوتا ہے اور جب آغاز کار پروردگار سے ہوا ہے تو گویا گھرانے میں ایک سیرت بن گئی کہ اب جو ہادی اور راہنما آئے گا اس کا نام بھی خدا ہی تجویز کرے گا تاکہ جدھر کا راہنما ہو اُدھر ہی کا نام بھی رہے۔ صلوات،

دوسری بات یہ ہے کہ نبیؐ اور امامؑ کے علم میں تو شک بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ خطرہ بھی ہے کہ مستقبل میں ایک قوم پیدا ہو جائے جو نبیؐ اور امامؑ کے علم غیب میں شک کرنا شروع کر دے۔ پیغمبرؐ نے چاہا کہ یہ نام میں معین نہ کروں کہ علم غیب میں شک کرنے والے فقط علامت سمجھ لیں بلکہ اسے خدا معین کرے کہ ہر مسلمان اسے کردار کی ضمانت سمجھے اور جو نہ سمجھے وہ علم خدا کا دشمن ہو کر اسلام ہی سے خارج ہو جائے۔

ولادت کی مسرت کو سات دن گزرے تھے کہ گھر میں ایک نئی تقریب مسرت آ گئی اور مرسل اعظمؐ نے فرزند کے عقیقہ کا اہتمام کیا، اسلام میں عقیقہ فریضہ نہیں ہے لیکن سیرت رسولؐ ضرور ہے اور شاید اسی کی مصلحت ہے کہ انسان

کی مسرت اس کی ذات تک محدود نہ رہ جائے اور اس کی مسرت سے غرباء و فقراء اور مومنین کو بھی فائدہ پہنچ جائے۔

عقیقہ کا مطلب سر منڈانے کا نہیں ہے۔ سر منڈانا الگ ایک کام ہے اور عقیقہ الگ، عقیقہ سے مراد وہ جانور ہے جو بچہ کی طرف سے ذبح کیا جاتا ہے اور جس کا گوشت غرباء و فقراء اور مومنین مخلصین پر تقسیم کیا جاتا ہے عقیقہ کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ سر منڈانے کے ساتھ ہی ہو، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں تقریبات الگ الگ ہوں۔ اور دونوں کو ایک وقت میں انجام نہ دیا جائے۔ سر منڈانے میں بالوں کا صدقہ مستحب ہے اور عقیقہ کرنے میں گوشت کی تقسیم یا دعوت جس کا کھلا ہوا مقصد یہ ہے کہ اسلام تقریبات کو شخصی یا تشریفاتی نہیں بنانا چاہتا۔ اس کا منشاء یہ نہیں ہے کہ خوشی اور مسرت کو گھر والوں تک محدود کر دیا جائے یا پھر اشراف اور رؤساء قوم کو شریک کر لیا جائے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ تمہاری مسرت کا انتظام ہم نے کیا ہے تو غریب بندوں کی خوشی کا انتظام تم کرو۔ شاید یہی مصلحت عید الفطر کے موقع پر فطرہ کی بھی ہے کہ ہم نے تمہیں سال بھر تک پالا ہے، کھلایا ہے، پلایا ہے۔ اب یہ کیسی ناانصافی ہے کہ تم اکیلے عید منالو اور غریب بندوں کا لحاظ بھی نہ کرو۔ اب کم از کم اتنا تو سوچ لو کہ تم ہمارے مقابلہ میں کمزور تھے تو تمہاری پرورش کا انتظام ہم نے کیا۔ اب جو بندے تمہارے مقابلہ میں کمزور ہیں ان کی پرورش کا انتظام تم کرو۔ یہ ہے اسلام کا نظام مسرت۔ دنیا کی خوشی کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں کو نظر انداز کر کے مسرت کا اظہار کیا جائے اور اسلام میں مسرت کی تکمیل ہی نہیں ہوتی جب تک غریبوں کو شامل نہ کر لیا جائے۔ رؤساء و اشراف

کا سہارا لے کر زندہ رہنا دنیا کے قوانین کا کام ہے، اور غریبوں، بے کسوں، یتیموں، مفلسوں کی زندگی کا انتظام کر کے زندہ رہنا اسلام کا کام ہے۔ یہاں دولتِ خدیجہ عیش و عشرت کا ذریعہ نہیں ہے۔ غرباء و فقراء کی پرورش کا ذریعہ ہے۔ یہاں غنی نہیں بنائے جاتے جناب امیر بنائے جاتے ہیں۔ صلوات۔

بعض کتابوں میں اس مقام پر ختنہ کا بھی ذکر ملتا ہے جو قطعاً صحیح نہیں ہے۔ قدرت کا انتظام ہے کہ وہ امام معصومؑ کو ختنہ شدہ پیدا کرتی ہے اور شاید اس کا راز بھی یہ ہے کہ ختنہ ایک کثافت کے جدا کرنے کا نام ہے اور امام کا وجود ہر کثافت سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کو سنتِ رسولؐ کہا جاتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ "سنت" رسولؐ کے عمل ہی کا نام نہیں ہے، رسولؐ کے فرمان کا بھی نام ہے۔ مسلمان کو یہ دیکھنے کا حق نہیں ہے کہ رسولؐ نے ذاتی طور پر کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ انھوں نے اس کے بارے میں کیا حکم دیا اور کیا فرمان نافذ کیا۔ اور جب یہ مسئلہ واضح ہو گیا تو اب نہ کہئے گا کہ رسولؐ نے گریہ کب کیا۔ ماتم کب کیا۔ تعزیہ کب بنایا۔ علم کب اٹھایا؟ اس کے لئے مسئلہ عمل رسولؐ کا نہیں ہے، مسئلہ اجازتِ رسولؐ کا ہے کہ انھوں نے ان اعمال سے کب روکا؟ اگر روکنا ثابت ہو جائے تو حرام ورنہ یہی عمل عین سنت و سیرت ہے۔ صلوات۔

پھر جبکہ روایت سے عزاداری کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے اور صراحت کیساتھ ملتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے شہادتِ حسینؑ سے قبل ہی غمِ حسینؑ منایا ہے اور اسے باقاعدہ طور پر سیرت و سنت بنا دیا ہے۔ کس قدر نادان اور ظالم ہے وہ مسلمان جو ایسے عظیم عمل کو بدعت اور حرام قرار دیدے۔ کاش اس مسلمان کو غیرت ہوتی اور

یہ اتنا سوچا کہ رسولؐ تو قبل واقعۂ غم سنائیں اور اسے واقعہ کے بعد بھی جواز نظر نہ آئے۔ صلوات

مالک کائنات نے زہراؑ کے اس لال کو امت کا ہادی اور راہنما بنا کر بھیجا تھا اور انتظام ہدایت کی ایک کڑی بنایا تھا۔ اسی لئے ابتدا ہی سے ایسے انتظامات کئے جن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اور ہے امت اور، اس کی شان اور ہے دنیا کی شان اور، اس کی عظمت اور ہے دنیا کی عظمت اور۔ اور اسی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ مالک کائنات نے اس کے جسم نازنین کو بھی رسول اکرمؐ کے جسم نازنین سے مشابہ بنا دیا، اور تاریخ کو اقرار کرنا پڑا کہ رسول اعظمؐ کے نصف بدن سے حسنؑ زیادہ مشابہ تھے اور نصف بدن سے حسینؑ۔ سر سے سینہ تک حسنؑ کی مشابہت تھی اور پائے اقدس حسینؑ سے زیادہ مشابہ تھے اور شاید اس میں بھی مالک کائنات کی یہ مصلحت رہی ہو کہ ہاتھ حسنؑ کے حصہ میں دے دیا جائے اور پیروں کی شباہت حسینؑ کے حصہ میں عطا کر دی۔ اس لئے کہ ان دونوں فرزندوں سے دو طرح کے کام لینے ہیں، حسن کے دست اقدس سے صلح نامہ لکھوانا ہے اور حسینؑ کو میدان جہاد میں استقلال اور پامردی کا مظاہرہ کرنا ہے، اب میں امت کو سمجھا دوں کہ حسنؑ کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے اور حسینؑ کے قدم میرے قدم ہیں، خبردار حسنؑ کی صلح یا حسینؑ کی جنگ پر اعتراض نہ کرنا ورنہ یہ اعتراض میری سنت و سیرت پر ہو جائے گا اور مجھ پر اعتراض کرنے والا مسلمان نہیں رہ سکتا۔ صلوات۔

فطرت نے اس قدر اہتمام کیا تو سرکار رسالت کا بھی فریضہ تھا کہ اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ یہ بچہ دنیا کے عام بچوں سے الگ ہے اور اسے اللہ نے امت کا راہنما بنا کر بھیجا ہے۔ اس کا قیاس دنیا کے عام انسانوں پر نہیں کیا

جا سکتا۔ اس کے ساتھ میں ایسا برتاؤ کر رہا ہوں جس کا دوسرے انسانوں کو اہل بھی نہیں سمجھتا، تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جہاں پہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی ہے اور اکثر واقعات تو دونوں بھائیوں کے درمیان مشترک طور پر ملتے ہیں، اور شاید اس کا راز بھی یہی رہا ہو کہ پورے سلسلۂ امامت میں پہلا اور آخری واقعہ ہے کہ مالکِ کائنات نے زہراؑ کو دو لال دیئے ہیں اور دونوں کو عہدۂ امامت سے سرفراز فرمایا ہے، ورنہ کوئی امام ایسا نہیں ہے جس کی اولاد میں دو امام ہوں اور اس کے گھر میں امامت یوں قائم ہوئی ہو جس طرح بیتِ زہراؑ میں آئی ہے اور جب مالک نے دونوں کو امام بنایا ہے تو اسی کی ذمہ داری ہے کہ فضائل و کردار میں بھی ایسی مشابہت و مناسبت رکھے کہ انسانوں کو دھوکہ نہ ہونے پائے اور لوگ فضیلت کی بحث میں نہ الجھنے پائیں قدرت کا یہی انتظام تھا کہ جو کچھ حسنؑ کو دیا اس میں حسینؑ کو شریک کر دیا اور جو کچھ حسینؑ کو دیا اس میں حسنؑ کو شریک بنا دیا۔ حد یہ ہے کہ شہادت کے عوض میں نسلِ حسینؑ میں امامت رکھی تو وہاں بھی یہ اہتمام کیا کہ ایک منزل پر دونوں کی نسل کو جمع کر دیا جائے کہ فرزندِ حسینؑ کے عقد کا موقع آئے تو دخترِ حسنؑ ہی کا انتخاب کیا جائے کہ نسلِ امامت آگے بڑھے تو کسی نہ کسی جہت سے دونوں بھائیوں کا حصہ رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس کی شہادت مخفی تھی اس کا سلسلہ بھی پردہ پوش ہو کر چلا۔ صلوات

مرسلِ اعظمؐ کا بھی یہی انداز ہے کہ سجدہ میں پشت پر جگہ دیتے ہیں تو کبھی اس بیٹے کو کبھی اس بیٹے کو، عید کے دن کاندھوں پر بٹھاتے ہیں تو ایک کاندھے پر اس فرزند کو اور دوسرے کاندھے پر اُس فرزند کو، کتنا نازک موقع ہے، رسالت اپنی زلفوں کو دو حصوں میں بانٹ کر دونوں بچوں کے حوالے کر رہی ہے اور بچے بچپنے کی اداؤں کے ساتھ دوشِ رسولؐ پر بیٹھے ہیں، سوچئے کہ اگر کہیں دونوں بچے مچل گئے اور ایک نے ادھر

کھینچنا شروع کیا اور دوسرے نے ادھر تو حضورؐ کی کیا کیفیت ہو گی اور سرکارِ دو عالمؐ کس کی خاطر رکھیں گے، کس کی بات مانیں گے۔

سرکار! یہ آپ نے کیا غضب کیا، بچوں کے ہاتھ میں زلفوں کا اختیار دے کر اپنے کو پریشانی میں ڈال دیا، پیغمبر اسلامؐ فرمائیں گے، نادان! یہ تیرے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں، یہ میری مصلحت کی بات ہے۔

یاد رکھو! اگر میرے ذہن میں ذرا بھی شبہ ہوتا کہ دونوں بچوں کے ارادوں اور مشیت میں فرق آجائے گا تو میں کبھی زلفوں کا اختیار ان کے حوالے نہ کرتا، یہ اختیار تو میں نے دیا ہی اسلئے ہے کہ تم جیسے نافہم انسان سمجھ لیں کہ حسنؑ و حسینؑ کی مرضی میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔ جو حسنؑ کی مرضی ہے وہی حسینؑ کی مرضی ہے، اب یہ کہنا کہ ایک نے صلح کی اور ایک نے جنگ کی تو دونوں کی مرضی میں فرق آگیا، ہرگز نہیں، حسنؑ کی صلح حسینؑ کی صلح ہے اور حسینؑ کی جنگ حسنؑ کی جنگ ہے۔ صلوات۔

عزیزانِ محترم! وہ فطرت کا اہتمام تھا یہ رسالت کا انتظام تھا تو اب ذرا قدرت کی ناز برداری بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بچپنے کا زمانہ ہے، دونوں شہزادے گھر سے باہر نکلے ہیں، اور حدیقہ بنی نجار کی ٹھنڈی ہوا کھا کر سو گئے ہیں، سیدہ عالمؑ پریشان ہیں، مرسلِ اعظمؐ تک خبر پہنچ گئی ہے۔ سرکارؐ! بچے کہیں چلے گئے ہیں، دیر ہوئی واپس نہیں آئے، سیدہ عالمؑ سخت پریشان ہیں۔ سرکار حسبِ قاعدہ تلاش میں نکلے، دیکھا کہ بچے حدیقہ بنی نجار میں آرام کر رہے ہیں۔ دونوں بچوں کو اٹھایا، شہزادو! تمہارے آرام کرنے کی جگہ یہ نہیں ہے چلو ماں پریشان ہے۔ بچوں کو اٹھایا اور فاطمہؑ کے گھر لانے کے بجائے اصحاب کی محفل میں لائے مسجد میں اصحاب کا مجمع تھا، بچوں کو سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ میں بتاؤں کہ دنیا میں نانا اور نانی کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔ اصحاب نے عرض کی ضرور۔

فرمایا حسنؑ و حسینؑ کہ ان کے نانا سیّد الانبیاء ہیں اور ان کی نانی خدیجۃ الکبریٰ
فرمایا کیا میں بتاؤں کہ ماں اور باپ کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔؟
اصحاب نے عرض کی۔ فرمائیں۔
فرمایا حسنؑ و حسینؑ کہ ان کا باپ علیؑ ہے اور ماں فاطمہ زہراؑ ہے ـــ فرمایا! میں بتاؤں کہ چچا اور پھوپھی کے اعتبار سے سب سے افضل کون ہے؟
عرض کی فرمایئے۔
فرمایا، حسنؑ و حسینؑ کہ ان کا چچا جعفر طیار ہے اور ان کی پھوپھی ام ہانی
اسی طرح سلسلہ جاری رہا اور سرکار شہزادوں کے فضائل بیان کرتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب سیدہؑ پریشان تھیں تو حضورؐ بچوں کو مسجد میں کیوں لے آئے اور سیدہؑ کے گھر کیوں نہیں لے گئے، اصحاب میں کون بیقرار تھا، یہاں کس کو پریشانی تھی، اور پھر اگر پریشانی تھی بھی تو یہ کون سا موقع تھا فضائل بیان کرنے کا۔ اں گھر میں مضطر ہے اور آپ مسجد میں فضائل بیان کر رہے ہیں۔
عجب نہیں سرکار دو عالم فرمائیں، تم نے مصلحت نہیں پہچانی، میرے بچے اس لئے نہیں گم ہوئے تھے کہ انہیں راستہ نہیں معلوم تھا، یا یہ راستہ بھٹک گئے تھے، میری سیدہؑ اس لئے نہیں پریشان تھی کہ اسے حفاظتِ الٰہی پر اعتماد نہیں تھا اور میں اس لئے نہیں تلاش کر رہا تھا کہ مجھے منزل نہیں معلوم تھی اور میں جگہ سے بے خبر تھا۔ یہ قدرت کا انتظام تھا کہ بچے باغ میں جا کر سو جائیں، سیدہؑ اپنے اضطراب کا اظہار کرے، میں تلاش میں نکلوں، اصحاب میں ہیجان پیدا ہو، دنیا کی نگاہ میں واقعہ کی اہمیت آ جائے، سب لوگ گمشدگی کے بعد بچوں کو دیکھنے کیلئے آئیں اور میں شہزادوں کے فضائل بیان کروں، اس لئے کہ عام حالات کے

بیانات ذہن سے نکل جاتے ہیں اور حادثاتی حالات کے بیانات ذہنوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں، یہ قدرت کا انتظام تھا کہ بچوں کے کمالات کا اعلان کرنا ہوا تو اس واقعہ کا اہتمام کیا اور باپ کے منصب کا اعلان کرنا ہوا تو غدیر کی دوپہر کا انتخاب کیا۔ صلوات

عزیزانِ گرامی! جب سب نے اپنے اپنے اہتمام و انتظام کا اظہار کر دیا تو اب خود امام حسنؑ کی ذمہ داری ہے کہ دنیا پر واضح کر دیں کہ میری مثال عام بچوں جیسی نہیں ہے اور مجھے قدرت نے خاص مقصد کیلئے خلق کیا ہے، میرا کام ہدایت لینا نہیں ہے، میرا کام ہدایت دینا ہے، شاید یہی راز تھا کہ جب مسجد میں پیغمبر اسلامؐ موعظ فرماتے تھے آیاتِ قرآنی اور احکام الٰہی بیان کرتے تھے تو امام حسنؑ گھر میں آکر ماں سے سارا واقعہ بیان کر دیا کرتے تھے، آج نانا نے یہ فرمایا، آج یہ مسئلہ بیان ہوا، آج یہ آیت نازل ہوئی اور جب امیرالمومنینؑ بیت الشرف میں تشریف لاتے تو جناب سیدہؑ فرماتی تھیں یا ابا الحسنؑ! آج میرے بابا نے یہ موعظ فرمایا، آج یہ مسئلہ بیان کیا، آج یہ آیت نازل ہوئی امیرالمومنینؑ بظاہر حیرت سے پوچھتے۔ سیدہؑ! یہ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا تم تو مسجد میں نہیں تھیں، تم نے تو اپنے بابا کو بیان کرتے نہیں دیکھا ہے۔

عرض کرتیں! میرا شہزادہ حسنؑ مجھ سے سارے واقعات بیان کر دیتا ہے مولائے کائنات نے فرمایا، سیدہ! میں بھی اپنے لال کی گفتگو سننا چاہتا ہوں۔ دیکھوں میرا فرزند کس طرح اپنے نانا کی ترجمانی کرتا ہے۔

سیدہؑ نے عرض کی بے شک! آپ سماعت فرمائیں۔

امیرالمومنینؑ موعظ ختم ہوتے ہی فوراً بیت الشرف میں تشریف لائے اور ایک گوشہ میں بیٹھ گئے، امام حسنؑ گھر میں داخل ہوئے،

مادرِ گرامی نے حسبِ روایت فرمائش کی۔ بیٹا آج بابا نے کیا بیان کیا۔

حسنؑ نے دہرانا شروع کیا، لیکن آج زبان میں وہ روانی اور بیان میں وہ سلاست نہیں تھی۔ گھبرا کر عرض کی۔ مادرِ گرامی۔ آج میرے بیان میں روانی اور میری زبان میں تیزی نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا سردار مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ سننا تھا کہ امیرالمومنینؑ پردہ سے باہر آگئے اور دوڑ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا، پیار کیا۔ شاباش میرے لال نبوت کے گھرانے کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

دیکھا آپ نے! حافظہ وہ کہ جو علیؑ نے بیان کیا وہ سب دہرا دیا، فصاحت وہ کہ وحیِ الٰہی کی ترجمانی کی اور وسعتِ نظر وہ کہ پسِ پردہ باپ کو دیکھ لیا۔ کیوں نہ ہو یہ امامت کی نگاہ ہے، اس کا انداز دنیا سے جدا گانہ ہے، یہاں تو یہ عالم ہے کہ "امامت" پردہ میں چھپ جائے تو اسے دیکھ لیا جاتا ہے اور "رسالت" زیرِ کساء آجائے تو اس کی خوشبو محسوس کر لی جاتی ہے۔ صلوات،

بات آخری منزل تک آگئی ہے لیکن خاتمۂ کلام میں چند فقرے اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امام حسنؑ معصوم تھے، انھیں پروردگارِ عالم نے علم دے کر بھیجا تھا۔ سیدہ طاہرہؑ بھی معصومہ تھیں، ان کے پاس بھی علمِ لدنی تھا، نہ معصومۂ عالم اس بات کی محتاج تھیں کہ امام حسنؑ بیان کریں تو انھیں مسائلِ شریعت کا علم ہو، نہ امام حسنؑ اس بات کے محتاج تھے کہ ماں سے بیان کریں تاکہ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ماں ٹوک دیں۔ اور خود جناب امیرؑ کا اشتیاق بھی معاذ اللہ اس بنا پر نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے۔ یا یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ حسنؑ کس حد تک صحیح بیان کرتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود سیدہ طاہرہؑ فرمائش کرتی تھیں، امام حسنؑ بیان کرتے تھے اور جناب امیرؑ کے دل میں اپنے لال کے بیان کا اشتیاق پیدا ہوا، امامت و عصمت کی مصلحت امام اور معصوم

جانے لیکن اتنا ضرور واضح ہو گیا کہ امت کی گنہگار ماؤں اور اولاد کو ایک درس مل گیا کہ جب بچے کسی محفل وعظ سے پلٹ کر آئیں تو ماں کو پوچھنا چاہیئے کہ آج کیا بیان ہوا، اور بچوں کو بیان کرنا چاہیئے اور پھر بزرگوں کو دیکھنا چاہیئے کہ بیان کا کیا انداز ہے، تاکہ بچوں کی تربیت کا انتظام ہو جائے۔ آل محمدؐ کے بچے محتاج تعلیم و تربیت نہیں تھے لیکن ہمارے بچے بہر حال محتاج ہیں۔

اب انصاف سے بتائیے کہ آج کسی گھر میں اس سیرت پر عمل ہوتا ہے، کیا! آجکی عورتیں معصومہ عالمؑ کی سیرت پر ہیں۔ کیا آج کے مرد مولائے کائناتؑ کی سیرت پر ہیں۔ کیا آج کے بچے امام حسنؑ کا اتباع کر رہے ہیں۔ ہر گز نہیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ دین تباہ ہوتا جا رہا ہے، دنیا غالب آتی جا رہی ہے، معلومات ختم ہوتے جا رہے ہیں اور لغویات کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ قیامت ہے کہ آج مائیں بچوں سے گانے تو سنتی ہیں، مجلسیں نہیں سنتیں، آج باپ بچوں کو خرافات کی تعلیم تو دیتے ہیں، دین کی تعلیم نہیں دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مستقبل انھیں خرافات سے وابستہ ہے اور منکر نکیر قبر میں آکے گانے ہی کے بارے میں سوال کریں گے۔

عزیزانِ گرامی! دنیا چند روزہ ہے، اسے ایک دن فنا ہو جانا ہے اور یہیں آپکو پلٹ کر معبود کی بارگاہ میں جانا ہے، دنیا کو دھوکہ دینا آسان ہے، رب العالمین کو جواب دینا بہت مشکل ہے۔ اگر آج محبت اہلبیتؑ باقی ہے اور سیرت اہلبیت پر عمل کرنے کا جذبہ ہے، اگر یہ جشن مسرت صرف رسم نہیں ہے اور اس کے پیچھے کوئی حقیقت ہے تو یہ عہد کر کے اٹھئے کہ سیرتِ امام حسنؑ سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بچوں کو دین و مذہب کی تعلیم دیں گے، معصومۂ عالمؑ کی سیرت پر عمل کریں گے اور اپنے بچوں سے مذہبی مسائل پوچھیں گے مولائے کائناتؑ کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور بچوں کے مذہبی معلومات کی نگرانی کرتے

رہیں گے۔

بات تمام ہوگئی۔ فضائل کو ایک کلمہ بیان کر کے تقریر کو تمام کردینا چاہتا ہوں۔ بڑی نازک منزل ہے، ہمارے کردار میں اور معصومین کے کردار میں زمین و آسمان کا فاصلہ ہوگیا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ایک راستہ سے گزر رہے تھے، ایک مقام پر دیکھا کہ ایک ضعیف العمر انسان بیٹھا وضو کر رہا ہے اور اتفاق سے اس کا وضو صحیح نہیں ہے۔ دونوں شہزادے ٹھہر گئے اور یہ طے کیا کہ مسئلہ کی اصلاح کئے بغیر قدم آگے بڑھانا جائز نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سمجھائیں تو کس طرح؟ ہماری طرح کہدیں کہ تیرا وضو صحیح نہیں ہے تو جاہل ہے، تو اخلاق آل محمدؐ کے خلاف ہے اور یہ کہدیں کہ وضو بہت عمدہ ہے تو یہ حکم الٰہی کے خلاف ہے۔ بچایئے آل محمدؐ نے تبلیغ دین حق میں کیا کیا راستے اختیار کئے ہیں۔ ایک مرتبہ قریب آکے فرمایا! حضور! آپ بزرگ آدمی ہیں، ہم دونوں بھائی وضو کرنا چاہتے ہیں، آپ ذرا زحمت کر کے یہ بتا دیجئے کہ دونوں میں کس کا وضو صحیح ہے؟ یہ کہہ کر دونوں نے وضو شروع کیا۔ جیسے ہی دونوں شہزادوں کا وضو تمام ہوا ضعیف العمر انسان چونک پڑا، بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ شہزادو! اس اخلاق کے قربان، اس تہذیب کے تصدق، تم دونوں کا وضو صحیح ہے، میں نے ہی غلط وضو کیا تھا!

بزور شمشیر اسلام کو پھیلانے والے دیکھیں کہ آل محمدؐ نے دین کی تبلیغ کس انداز سے کی ہے اور دنیا کو راہ راست پر کس طرح لائے ہیں۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ اختلاف نہ معرکہ، نہ بحث نہ مباحثہ، نہ دل کا توڑنا، ایک ایسا حسین انداز کہ جسے تنبیہ کیجئے وہ بھی قربان ہو جائے اور جسے سمجھایا جائے وہ بھی گلے لگا لے۔ دنیا نے اخلاق پیغمبرؐ سنا ہے تو اخلاق حسنؑ کا مشاہدہ بھی کرلے اور یہ دیکھ لے کہ صاحب خلق عظیم کا

وارث کیسا ہوتا ہے اور اسلام کس تلوار سے پھیلتا ہے اور میں تو ایک فقرہ کہے بغیر بیان تمام نہیں کر سکتا کہ ہمارے کردار میں اور معصومینؑ کے کردار میں اتنا فرق ہوگیا ہے کہ کل بچے بڑوں کی اصلاح کر دیا کرتے تھے اور آج بڑے بھی بچوں کی اصلاح نہیں کر پا رہے ہیں۔ گویا امت آواز دے رہی ہے کہ جو تمھارا نانا ممکن ہے وہ ہمارا مشغلہ ہے اور یاد رکھو ہمیں بچہ نہ سمجھنا ہم نے کتنے ہی بڑے بوڑھوں کی اصلاح کر دی ہے۔ ہماری عظمت امت کے بچے نہ سمجھیں گے، ہماری بلندی امت کے بوڑھے ہی سمجھے ہیں۔ جنھوں نے نانا سے یہ کہہ کر لینا چاہا تھا کہ بچوں کو ہمیں دے دیجیے ہم اپنے کاندھوں پر بٹھا لیں گے تو نانا نے انکار کر کے واضح کر دیا تھا کہ آل محمد دنیا کو اٹھانے کے لئے آئے ہیں، یہ اہل دنیا کے اٹھانے کے محتاج نہیں ہیں۔ صلوات،

چوتھی مجلس — داستانِ عزیمت امام حسن مجتبیٰؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائھم اجمعین ـــ

امابعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ـــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ

ارشادِ جنابِ احدیت ہوتا ہے! بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ارشادِ گرامی سے واضح ہو گیا کہ عالمِ بشریت کی ہدایت و راہنمائی میں کسی بشر اور کسی انسان کا دخل نہیں ہے، یہ کام صرف رب العالمین کا ہے اور وہ برابر انجام دیتا ہے۔ یاد رکھئے! مالکِ کائنات نے صرف اعلان کر دیا ہوتا اور کوئی عملی مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو بھی امت کو یقین کر لینا چاہیے تھا۔ چہ جائیکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ اس قانون پر عمل کرنے کے بعد بھی امت کو اعتبار نہ آیا اور یہی خیال ذہن میں رہ گیا کہ اپنی ہدایت کا انتظام ہمیں خود کرنا ہے اور رب العالمین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ جس قوم کو خدا کی تقریر پر اعتبار نہ آیا اسے نبی کی سیرت پر کیا اعتبار آئے گا۔

مالکِ کائنات نے ہر دور اور ہر عہد میں ہدایت کا انتظام کیا اور اس کے انتظام میں سن و سال اور قد و قامت کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس نے کمسن افراد کو بھی ذمہ دار بنایا ہے اور مُسن افراد کو بھی، چھوٹے قد والوں کو بھی دین کا عہدہ دار

بنایا ہے اور دراز قامت انسانوں کو بھی، اس کے یہاں ایسی کوئی تفریق نہیں
اس کا نمائندہ دنیا سے منصب دار بن کر آتا ہے۔ اس کے نمائندے بنیادی
طور پر کمسن اور کم عمر ہی ہوتے ہیں۔ وہ بوڑھوں کو منصب دار نہیں بناتا بلکہ اب
ہی سے منصب دار بنا کر بھیجتا ہے۔

آج آپ کے سامنے ایک ایسے ہی راہنما اور ہادی کا تذکرہ کرنا ہے جس نے
بچپن ہی سے کارِ تبلیغ شروع کر دیا اور امت کی راہنمائی کی ذمہ داری سنبھال
لی۔ قانونی طور پر ذمہ داریاں بہت دیر میں منتقل ہوئیں لیکن عملی طور پر وہ کارہائے
نمایاں انجام دیئے کہ ہادیٔ اعظمؐ کو گود میں لیکر فرمانا پڑا کہ "یہ میرے دونوں
فرزند امام ہیں چاہے کھڑے رہیں یا بیٹھ جائیں۔ یہ دونوں جوانانِ اہلِ جنت
کے سردار ہیں اور ان کا باپ ان سے بھی افضل ہے"۔ پیغمبر اسلامؐ نے نہیں فرمایا
کہ یہ دونوں بچے امام ہوں گے اور انھیں سردار بنایا جائے گا بلکہ یہ فرمایا
کہ یہ دونوں امام ہیں اور جوانانِ جنت کے سردار ہیں، تاکہ دنیا واضح ہو جائے
کہ اللہ والوں کا کمال سن و سال اور حالات کا پابند نہیں ہوتا، وہ جہاں
رہتے ہیں، جیسے رہتے ہیں صاحبِ کمال ہی رہتے ہیں، صلوات،

بلکہ واضح لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ جائے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اشارہ
کر دیا کہ امت کے بوڑھے بھی اگر جنت میں جانا چاہیں تو ان بچوں کو اپنا
سردار اور ان کے باپ کو ان سے افضل مانیں، انھیں جنت کا سردار اور
ان کے باپ کو ان سے افضل مانے بغیر نہ دنیا میں اسلام رہ جائے گا اور
نہ آخرت میں جنت و کوثر کی امید رہ جائے گی۔ جنت ان کے قبضہ میں
ہے اور کوثر پر ان کے باپ کا قبضہ ہے، صلوات،

آج مجھے اس شہزادۂ صلح و امن، سردارِ جوانانِ جنت، سبطِ رسولؐ، راجانِ بتو

امام امت اور مصلح ملت کا تذکرہ کرنا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ یہ ہے کہ

۳ھ میں ماہ رمضان المبارک کی پندرہ[۱۵] تاریخ کو ولادت ہوئی۔ سات برس نانا کے

زیر سایہ گزارے، نانا کے بعد چند ماہ ماں کا ساتھ رہا، ماں کے بعد ۳۰ سال کا عرصہ باپ

کے زیر سایہ گزارا۔ ۴۰ھ میں باپ کی شہادت کے بعد دس[۱۰] سال کا زمانہ اپنے فرائض کی

انجام دہی میں گزارا جس میں شریک کار، اور مددگار چھوٹے بھائی امام حسینؑ اور چند

اطاعت شعار افراد کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

تقریباً ۴۷ سال کی اس زندگی میں اسلامی تاریخ کے بے شمار واقعات

کا مشاہدہ کیا اور حالات و مصالح کے مطابق واقعات میں حصہ بھی لیا ۵ھ میں

جنگ خندق دیکھی، ۶ھ میں صلح حدیبیہ کا مشاہدہ کیا، ۷ھ میں جنگ خیبر دیکھی، ۸ھ

میں فتح مکہ کا مشاہدہ کیا، ۹ھ میں مباہلہ میں شرکت کی، ۱۰ھ میں آخری حج میں

شریک رہے، ۱۱ھ کے آغاز میں ۲۸ صفر کو نانا کا غم برداشت کیا اور اسی ۱۱ھ

میں نانا کے چند دن کے بعد ماں کا داغ دیکھا، باپ کے مسائل الگ قابل دید تھے

میراث لٹی، جاگیر چھینی، تخت و تاج گیا، عزت و احترام رخصت ہوا، سلام و کلام

بند ہوا، قرآن واپس ہوا اور تقریباً ۲ ۱/۲ سال تخت حکومت پر ایک حاکم کا قبضہ

رہا، دس[۱۰] سال دوسرے حاکم کا قبضہ رہا، بارہ[۱۲] سال تیسرے حاکم کا قبضہ رہا، چند سال

کی حکومت باپ کو ملی تو اس میں بھی فتنوں، ہنگاموں، شورشوں اور بغاوتوں کا ایک

طوفان رہا، عنانِ حکومت سنبھالتے ہی خونِ عثمان کے نام پر ام المومنین جمل کے میدان

میں آگئیں، ان سے فرصت ملی تو معاویہ نے صفین کا معرکہ گرم کر دیا، اس سے نجات

ملی تو خوارج نہروان کے میدان میں اتر پڑے، اور بالآخر حکومت شام کی سازش سے

۴۰ھ کے ماہ رمضان میں ۱۹ ویں تاریخ کی صبح کو باپ کے سرِ اقدس پر ابن ملجم کی تلوار لگی، اور ۲۱ رمضان کی صبح کو باپ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

باپ کے بعد ۴۱ھ میں حالات کے تحت حکومت شام سے صلح کی اور ۵۰ھ میں خاموش زندگی گزارنے کے باوجود حکومت شام کی قدیم سازش کی بنا پر جعدہ بنت اشعث کے ہاتھوں ۲۸ صفر کو زہر دغا سے شہید ہو گئے۔

تفصیلی حالات کا تذکرہ بعد میں کیا جائیگا، اجمالی طور پر یہ دیکھ لیا جائے کہ ۴۷ سال کی زندگی کتنے مصائب و آلام سے گزری ہے اور کس طرح حالاتِ دنیا کا مقابلہ کیا ہے اور کوئی موڑ زندگی کا ایسا نہیں آیا جس میں کسی نہ کسی انداز سے حصہ نہ لیا ہو۔ بچپنے کے واقعات میں بھی خاموش تماشائی نہیں رہے اور تعلیم و تربیت کے طور پر حالات کو نہیں دیکھا۔ بلکہ اکثر مقامات پر ذمہ دارانہ حیثیت سے حصہ لیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا بچپنا اور ہے اور امامت کا بچپنا اور۔

اخلاق میں نبیؐ کا انداز، کردار میں علیؑ کا انداز، صبر میں زہراؑ کا انداز، شجاعت میں ہاشم کا جلال، استقلال میں ابوطالب کے تیور، ایمان و یقین میں عبدالمطلب کا نقشہ، خاندان کی عزت، بزرگوں کی یادگار، مذہب کا ذمہ دار، اسلام کا خطیب، نقیب، قرآن کا مفسر، امت کا مصلح، کعبہ کا محافظ اور سیرتِ رسولؐ کا ایسا وارث کہ جب ہجوم مصائب میں طعن و طنز کے باوجود حدیبیہ کی تاریخ دہرا کر صلح کر لی اور اسلام کو ایک بڑے خطرے سے بچا لیا تو قدرت کو یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ دونوں کی تاریخ وفات کو ایک کر دیا، کہ جس تاریخ میں پہلا مصلح دنیا سے گیا تھا اسی تاریخ کو دوسرا شہزادہ صلح بھی دنیا سے رخصت ہوا۔

امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی کے اس خاکہ کو نظر میں رکھنے کے بعد دو اہم پہلوؤں کی

نظر کرنا پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ آپ کی ذاتی شخصیت اور آپ کا ذاتی کردار کیا تھا ؟ اور دوسرے یہ کہ آپ نے کن حالات کا سامنا کیا ہے اور ان حالات میں آپکا طرزِ عمل کیا رہا ہے؟

جہاں تک پہلے موضوع کا تعلق ہے تاریخ میں بے شمار واقعات ملتے ہیں جن سے آپ کی عظمت وجلالت کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ کے واقعات کیا خود قرآن مجید کی آیتیں اور مرسلِ اعظمؐ کے ارشادات عظمت کی گواہی دے رہے ہیں، آیۂ تطہیر عصمت کا اعلان کر رہی ہے، آیتِ مباہلہ صداقت کا اعلان کر رہی ہے، آیت صلح کروا۔ پر روشنی ڈال رہی ہے اور سورۂ دہر سخاوت کا قصیدہ پڑھ رہا ہے، صلوات،

مرسلِ اعظمؐ کی زندگی کو دیکھیں گے تو دہاں بھی قول وعمل سے مسلسل فضائل وکمالات کا اعلان ملے گا، کبھی اپنے لال کو سردار جوانانِ جنّت کہیں گے، کبھی امام کے لقب سے یاد کریں گے، کبھی اپنا سبط اور نائب قرار دیں گے اور کبھی اصلاح امت کا مژدہ سنائیں گے، کبھی اسے اپنے سے قرار دیں گے اور کبھی اپنے کو اس سے قرار دیں گے، صلوات،

اور یہ کمالات فقط زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ان کا اظہار ہو گا، نواسہ مسجد میں آجائے گا تو منبر سے اتر کر گودی میں اٹھالیں گے، سجدہ میں آجائے گا تو سر اٹھائیں گے، عید کا دن ہوگا تو کاندھے پر بٹھائیں گے، مباہلہ کا موقع ہوگا تو انگلی پکڑ کر لے چلیں گے، تطہیر کی منزل ہوگی تو گلے سے لگا کر ضعف رسالت کو قوت میں تبدیل کریں گے، زہراؑ کے گھر آئیں گے تو دہنِ اقدس کے بوسے لیں گے اور مہر فی کا بچّہ آجائے گا تو اسے شہزادے کے حوالے

کر دیں گے۔

تاریخ نے مختلف منزلوں پر فضائل و کمالات کا اعتراف کیا ہے علم کا یہ عالم ہے کہ امیرالمومنینؑ کے پاس جب کوئی مسئلہ آجاتا ہے تو اپنے فرزند ہی سے جواب دلواتے ہیں۔ اور حکومت وقت تو بہر حال امامت کی محتاج ہے،

مشہور و معروف واقعہ ہے کہ بادشاہ روم نے حاکم شام معاویہ بن ابی سفیان سے دو سوالات کئے، زمین پر وہ کون سی جگہ ہے جو آسمان کے ٹھیک وسط میں واقع ہے اور زمین کا وہ کون سا خطہ ہے جس پر سورج کی روشنی صرف ایک مرتبہ پڑی ہے، حاکم شام جواب سے عاجز ہو گیا اور مسئلہ کو امام حسنؑ کے سامنے پیش کر دیا، آپ نے فرمایا کہ وسط آسمان کی زمین میں پشت خانۂ کعبہ ہے، اور ایک مرتبہ سورج کی روشنی دیکھنے والی نیل کی گہرائی ہے جس پر صرف جناب موسیٰؑ کے گذرتے وقت آفتاب کی روشنی پڑی تھی، اس کے بعد پھر دریا حائل ہو گیا اور سورج کی شعاع نہ پہنچ سکی۔

آپ نے اندازہ کیا کہ امام حسنؑ نے کس آسانی سے مسائل کو حل کر دیا اور واضح کر دیا کہ حاکم شام جب تجھے زمین کی خبر نہیں ہے تو آسمان کی خبر کیا ہو گی اور جب تو بیت کے فضائل سے باخبر نہیں ہے تو اہلبیتؑ کے کمالات کو کیا سمجھے گا۔؟

اس علم کی وسعت و جامعیت کا یہ عالم تھا کہ اپنوں کا کیا ذکر غیروں نے بھی اقرار کیا ہے کہ امام حسنؑ گہوارہ سے لوح محفوظ کا مطالعہ کیا کرتے تھے، یاد رہے کہ اعتراف فضیلت میں ایک ایسی روایت:

بھی شامل کر دی کہ فضیلت روشن ہو کر سامنے نہ آسکی، لیکن مجھے روایت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ دشمن نے فضائل کا اقرار کیا ہے اور ایسی روایت کا اضافہ تو ہونا ہی چاہئے تھا کہ ایسے ہی حالات گہوارہ کے علم پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر زلیخا نے کردار یوسف سے غلط روایت وابستہ نہ کی ہوتی تو گہوارہ کا بچہ کیسے بولتا۔ اگر یہودیوں نے جناب مریم کے ساتھ غلط تہمت منسوب نہ کی ہوتی تو عیسیٰؑ کا کمال کیسے سامنے آتا اور اگر امت میں ایسی روایت نہ ہوتی تو امام حسنؑ کے علم کا اقرار کیسے کیا جاتا۔؟

علم کے بعد عمل کی منزل آتی ہے: زہد و تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ سادہ لباس میں زندگی گزار رہے ہیں اور اگر کبھی مجبوراً عمدہ لباس پہن لیا اور یہودی نے اعتراض کر دیا کہ آپ کے جد نے تو فرمایا ہے کہ دنیا کافر کے لئے جنت ہے اور مومن کے لئے قید خانہ، یہ آپ کا لباس مجھ سے بہتر کیوں ہے؟ تو ایک عظیم حقیقت کا اعلان فرما دیا کہ یاد رکھو، بہتر اور بدتر کا فیصلہ نتیجہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمہیں آخرت میں جو کچھ ملنے والا ہے اس کے اعتبار سے یہ لباس کہیں بہتر ہے اور مجھے جنت میں جو کچھ حاصل ہونے والا ہے اس کے اعتبار سے یہ ایک قیدی کا لباس ہے۔ یا واضح لفظوں میں یوں کہدیا جائے کہ یہودی حقائق سے بے خبر تھا ورنہ یہ سوال ہی نہ اٹھاتا، اسے یہ معلوم ہوتا کہ جس کے محل جانے پر جنت سے لباس آجاتا ہے اس کے لئے دنیا کا لباس تو بہرحال ایک قیدی کا لباس ہوگا۔

زہد و تقویٰ کے ساتھ اس عظیم دسترخوان کا بھی اضافہ کر لیجئے جس پر مہمانوں اور مسکینوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے تو کمالات کی منزل اور نمایاں ہو جائے گی کہ ایک طرف اپنی زندگی میں یہ سادگی کہ ایک دن لباس کو دیکھ کر یہودی کو تعجب ہو گیا اور وہ سوال کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے سوال نے واضح کر دیا کہ اگر امام حسنؑ کی زندگی میں راحت پسندی اور عیش و آرام کا دخل ہوتا تو یہودی کو تعجب نہ ہوتا۔ یہودی کا تعجب خود کردار کی بلندی کی ایک دلیل ہے۔

اور دوسری طرف وہ عظیم دسترخوان جس کی بنا پر خلق حسنؑ کا شہرہ ہوا اور جس کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل دروازہ سے واپس نہ جانے پائے، آل محمدؐ کی زندگی میں یہ کوئی خاص بات نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ ان کے گھر کا معمول ہے، جن کے گھر مدینہ کے سائل بھی آتے ہیں اور آسمان کے فرشتے بھی اور قرآن کا سورۂ دہر بھی۔ صلوات،

لیکن پھر بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ اہلبیتؑ کی اپنی زندگی کتنی سادہ تھی اور ان کی خدمت خلق کا عالم کیا تھا۔ مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ایک شخص امام حسنؑ کے دسترخوان پر مہمان ہوا، اور کھانے کے لئے بیٹھا تو عالم یہ تھا کہ ایک لقمہ کھاتا تھا اور ایک لقمہ بچاتا جاتا تھا آپ نے فرمایا بھائی! کیا تو صاحب عیال ہے؟ اس نے کہا نہیں، میں نے مسجد میں ایک شخص کو سوکھی روٹیاں کھاتے دیکھا ہے، چاہتا ہوں کہ اسکی بھی کچھ امداد کر دوں۔ آپ نے فرمایا بھائی! وہ میرے باپ مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالب ہیں، ان کی زندگی کا یہی معمول ہے کہ ہم اہلبیتؑ جو دنیا کو کھلاتے ہیں وہ اور ہوتا ہے اور جس پر خود اپنی زندگی گذارتے ہیں وہ

اور ہوتا ہے۔ تو رزقِ دنیا کھانے اور اپنا راستہ لے، ہم اہلبیتؑ کی فکر نہ کر، ہماری نعمتوں کا دسترخوان وہاں بچھایا گیا ہے۔

عزیزانِ محترم! یہ ایک مسافر، غریب اور عام مسلمان کی بات ہے۔ حسن مجتبیٰؑ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اسے دیکھ کر بڑے بڑے سلاطینِ وقت دنگ رہ جاتے تھے تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ مدینہ آیا اور اعلانِ عام کر دیا کہ لوگ بادشاہِ وقت کو سلام کرنے کی غرض سے حاضر ہوں، خزانوں کا منھ کھلا ہوا ہے، آج لوگوں کو انعام تقسیم کیا جائے گا۔ لوگ آنے لگے اور دولت تقسیم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ امام حسنؑ کو بھی مجبور کیا گیا، آپ دربار میں آخری وقت تشریف لائے، معاویہ نے ارکانِ دولت کی طرف اشارہ کیا کہ حسنؑ نے آنے میں صرف اس لئے دیر کی ہے کہ میرا خزانہ خالی ہو جائے اور مجھے شرمندگی کا منھ دیکھنا پڑے۔ تو یہی کہ صبح سے ابتک جس قدر مال تقسیم ہوا ہے اتنی ہی مقدار میں تنہا حسن مجتبیٰؑ کو دیدیا جائے، دشمن کا عمل گواہی دے رہا ہے کہ جو حیثیت ساری امت کی ہے، وہ وقار تنہا زہراؑ کے لال حسن مجتبیٰؑ کا ہے۔

خزانوں کے منھ کھول دیئے گئے، جواہرات اکٹھا ہونے لگے، معاویہ مسکرا رہا ہے، امام حسنؑ دیکھ رہے ہیں، جب سب مال اکٹھا ہو گیا تو معاویہ نے بڑے غرور سے کہا۔ لیجئے یہ مال آپکے لئے ہے، آپ نے قبول فرما لیا اور چلنے کا ارادہ کیا۔ معاویہ کے خادم نے بڑھ کر جوتیاں سیدھی کر دیں۔ آپ نے مال کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ کہ تو نے میری خدمت کی ہے اور ہم اہلبیت کسی کا احسان نہیں لیتے لہٰذا یہ کل مال تیری خدمت کا صلہ ہے۔

ارباب کرم! دیکھا آپ نے جو مال معاویہ نے امام حسنؑ کو فرزندِ رسولؐ سمجھ

بڑے غرور سے دیا تھا اسے امام حسنؑ نے معاویہ کے غلام کو عطا کر دیا اور واضح کر دیا کہ اب دونوں کے کرم کا فرق پہچان لے، جتنا تو نواسۂ رسولؐ کو دیتا ہے اتنا تو ہم ایک غلام کو دیدیا کرتے ہیں۔

اور میں تو کہوں گا مولا! اس شانِ کرم پر ہماری جانیں قربان، آپنے غلاموں کا دل رکھ لیا اور اب تو یہ اطمینان ہو گیا کہ جب آپ معاویہ کے غلام کو اتنی بڑی دولت دے سکتے ہیں تو جب قیامت کے دن آپکے اپنے غلام آئیں گے تو انھیں کیا نہ دیدیں گے۔ صلوات،

لیکن عزیزانِ محترم! یاد رکھئے، یہ سب کچھ معاویہ کے غلام کو ملا ہے معاویہ کو نہیں ملا، گویا امام حسنؑ نے واضح کر دیا کہ ہمارے یہاں خدمت کرنے والوں کی قدر ہے مقابلہ کرنے والوں کی نہیں۔

واقعہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت اور امامت کی نگاہ میں مال دنیا کی کیا قیمت ہے۔؟ حکومت اعلان کر رہی ہے کہ مال دنیا میں رسولؐ کی قرابت تولی جاتی ہے اور امامت آواز دے رہی ہے کہ ہم مال دنیا میں اپنی جوتیوں کو تولا کرتے ہیں، ہم خزانۂ شاہی کو رسالت سے منسوب نہیں کرتے اپنی جوتیوں میں رکھا کرتے ہیں۔ صلوات،

وقت نہیں ہے ورنہ واقعہ کے دوسرے خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی جاتی اور یہ دیکھا جاتا کہ امام حسنؑ نے ایک ہی واقعہ میں کتنے مسائل کا حل پیش کر دیا ہے، اس وقت تو صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اہلبیتؑ کی تواضع و خاکساری، ان کی عبادت و ریاضت، ان کا زہد و تقویٰ اور ان کی سخاوت و عنایت اس منزل پر تھی کہ اہل دنیا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے،

حج بیت اللہ کے لئے جا رہے ہیں، ناقے آگے آگے، اور خود پیادہ پا، دنیا دیکھ رہی ہے کہ مشقت و زحمت کے ساتھ عبادت کیسے کی جاتی ہے؟ اور اللہ والوں کی نگاہ میں خانۂ خدا کی عظمت کیا ہے اور جب مکان کی یہ عظمت ہے تو مالک مکان کی کیا جلالت ہوگی۔؟

عملی زندگی میں بھی امام حسنؑ کی انفرادیت قابلِ ملاحظہ ہے، زندگی چند ہی منزلوں سے گزری ہے مگر خندق، خیبر، حنین، فتح مکہ، غدیر، سارے واقعات نگاہوں سے گزر گئے اور سب میں کسی نہ کسی مقدار میں حصہ بھی لیا، وفات پیغمبر کے بعد مصائب کا سلسلہ شروع ہوا، حق چھنا، گھر جلا، محسنؑ کی شہادت واقع ہوئی، باپ کی حکومت گئی، ماں کی تکذیب کی گئی۔ اور امام حسنؑ حالات کا گہرا مطالعہ کرتے رہے، جس دن موقع ملے گا امت کو بتاد ونگا کہ تمہاری بساط و اوقات کیا ہے؟ میرے باپ کا حق چھین لیا، میری مادرِ گرامی سرِ دربار آئیں اور ان کے دعویٰ کو رد کر دیا، حد یہ ہے کہ خود مجھے بھی گواہی میں پیش کیا گیا لیکن معصوم بچوں کی گواہی کو بھی نہ مانا... عصمت کے اعلیٰ تصور سے ناواقف تھے تو کمسن بچوں ہی کی عصمت پر اعتماد کر لیا ہوتا، آخر حضرت یوسف کے مسئلہ میں بچہ کی گواہی مانی گئی یا نہیں لیکن یہاں تو فلسفہ ہی دوسرا ہے، خیر آج منبر رکھا را قبضہ ہو گیا ہر سو جا ہو فیصلہ کرو، وقت آنے دو، میں تمہیں تمہاری حقیقت سے با خبر کروں گا۔

چند دن گزرے تھے کہ شہزادے کا گزر مسجد کی طرف سے ہو گیا، دیکھا بادشاہ وقت منبر پر تشریف فرما ہیں اور اپنے حوالی موالی کے درمیان

کچھ وعظ و نصیحت فرما رہے ہیں، امام حسنؑ آگے بڑھے اور پڑھ کر فرمایا آپ میرے باپ کے منبر سے اتر آؤ جہاں تمہارے باپ کا منبر ہو وہاں جاؤ۔ لہجہ میں کچھ اس قدر جلال تھا کہ کوئی بچپنا کہہ کر نہ ٹال سکا اور حاکم وقت کو منبر سے اترنا پڑا، یا اور بات ہر کو شرمندگی کو مٹانے کے لئے شہزادے کو گود میں لے کر منبر پر گئے اور فرمایا بیشک یہ ان کے باپ کا منبر ہے، میرے باپ کا نہیں ہے۔

عزیزانِ محترم! واقعہ آپ کی نگاہوں میں ہے، اب ذرا ایک ایک لفظ کا تجزیہ کیجئے تو کتنے ہی حقائق سامنے آجائیں گے۔ شہزادہ صلح نے اپنے باپ کا منبر کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ میرے نانا کا بھی منبر ہے اور میرے بابا کا بھی منبر ہے۔ اگر بابا کا منبر سمجھتے ہو تو تمہیں بیٹھنے کا حق نہیں ہے اور اگر نانا کا منبر سمجھتے ہو تو تسلیم کرو کہ میں ان کا فرزند ہوں اور مباہلہ کے میدان میں ان کی صداقت و حقانیت کی گواہی کے لئے میں ہی گیا تھا۔ صلوات،

"اپنے باپ کے منبر پر جاؤ" کہہ کر امت کی بے کسی کی طرف اشارہ کر دیا کہ تخت و تاج پر قبضہ کرنے والوں کا کوئی ماضی نہیں ہے اور ان کے آبا و اجداد میں کوئی صاحب منبر تھا، اب یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس کے گھر کا منبر ہے وہ زیر منبر رہے اور جس کے بزرگوں نے منبر نہیں دیکھا وہ بالائے منبر جلوہ افگن ہو جائے۔

بادشاہ وقت نے بھی منبر سے اتر کر امام حسنؑ کے بیان کی تصدیق کر دی اور عصمت حسنؑ نے آواز دی "ابھی چند ہی دن گزرے ہیں جب تم نے میری گواہی کو رد کر دیا تھا، دیکھا تم نے کس طرح میں نے اپنے

حق کا اقرار لے لیا اور تمہیں منبر سے اتار لیا۔

قربان اس شہزادۂ صلح فرزند رسولؐ کے کہ قیامت تک کے لئے منبر کا فیصلہ کر دیا، اب کسی بھی آنے والے بادشاہ کے لئے یہ جواز نہ رہے گا کہ یہیں امت سے منبر ملا ہے یا سابق خلفا و سلطان سے منبر ملا ہے، اس لئے کہ منبر امام حسنؑ کے بزرگوں کا ترکہ ہے، نہ کسی امت کو قبضہ کرنے کا حق ہے نہ بادشاہ کو، اس منبر پر جو بھی قدم رکھے گا وہ حق آل محمدؐ کا غاصب ہوگا، اور غاصب کو حقدار نہیں کہا جا سکتا۔

دیکھا آپ نے، ایک خاموش انسان نے کس طرح بڑے بڑے خطیبوں کی زبانیں بند کر دیں، اور حقائق کے دریا بہا دیئے، پہلی منزل پر حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے بعد امام حسنؑ نے سکوت اختیار کر لیا اور باپ کی روش پر قائم رہے، باپ خانہ نشین رہے تو فرزند نے بھی گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی، اور تھوڑے عرصہ کے بعد باپ جمل کے میدان میں سفر آیا تو بیٹا بھی علم لشکر لے کر میدان میں آ گیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ جمل میں علم لشکر محمد حنفیہ کے ہاتھوں میں تھا لیکن جب محمد حنفیہ بار بار حملہ کرتے سے رک گئے تو امیرالمومنین نے علم لشکر امام حسن کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا: میرے لال فوراً اس صاحب محمل کے اونٹ پر حملہ کرو، امام حسنؑ پرچم لے کر آگے بڑھے اور چند لمحوں میں جمل تک پہنچ گئے، اونٹ کو نیزہ مارا اور مسکراتے ہوئے باپ کی خدمت میں آ گئے۔ محمد حنفیہ حسرت سے دیکھتے رہ گئے اور علیؑ کے لال نے معرکہ کو سر کر لیا، مولائے کائنات نے دونوں کا دل رکھنے کے لئے فرمایا، محمد! پریشان نہ ہو

تم میں اور حسنؑ میں بڑا فرق ہے، تم میرے فرزند ہو اور یہ رسول اللہؐ کے فرزند ہیں۔ یہ ظرف بھی مولائے کائناتؑ کا تھا ورنہ دنیا کا کوئی اور انسان ہوتا تو بلندی کو اپنی طرف منسوب کرتا اور کہتا کیوں نہ ہو، یہ طرفین سے ہاشمی ہونے کا اثر ہے، لیکن مولائے کائناتؑ نے کمال کو پیغمبرؐ کی طرف منسوب کر کے دنیا پر واضح کر دیا کہ اپنے لئے جینا اور ہوتا ہے اور پیغمبرؐ کے لئے زندہ رہنا اور ہوتا ہے،

صفین اور نہروان میں بھی امام حسنؑ کی یہی کیفیت تھی اور باپ کے زیر سایہ برابر مجاہدات میں حصّہ لیتے رہے۔ ۴۰ھ میں شام کی حکومت نے اپنی پے در پے شکست کا انتقام لینے کے لئے ابن ملجم سے سازش کی اور مسجد کوفہ میں عین حالت سجدہ میں امیرالمومنینؑ کو شہید کرا دیا۔ اور علیؑ نے اس شہادت کو بھی اپنی کامیابی قرار دیکر فزت ورب الکعبہ کا اعلان کر دیا۔ شہادت امیرالمومنینؑ کے بعد امام حسنؑ کی زندگی کا مستقل دور شروع ہوتا ہے، اب تک کبھی نانا کے ساتھ رہے، کبھی بابا کے ساتھ، اب امت کے جملہ معاملات کے خود ذمّہ دار ہیں اور قوم کے مقدر کا فیصلہ اپنے ہی ہاتھوں کرنا ہے، چنانچہ آپ نے بابا کی شہادت کے بعد ایک تاریخی خطبہ پڑھا اور امت کو جملہ حالات سے باخبر کرتے ہوئے بیعت لی، معاویہ ابن ابی سفیان کو اس بیعت کی اطلاع ملی تو ۶۰ ہزار کا لشکر روانہ کر دیا اور عراق کو زیر کرنے کا منصوبہ بنا لیا، آپ نے بھی ۴۰ ہزار کا لشکر مرتب کیا لیکن ایک منزل پر جب آپ نے صلح آمیز گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو فوج میں بغاوت پھیل گئی اور لوگوں نے یہ نعرہ لگایا،

تو معاذ اللہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح گمراہ ہیں۔ کل! انھوں نے بھی صلح کرلی تھی اور آخر کار شکست کھا گئے تھے اور آج یہ بھی صلح کرکے امت کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہیں۔ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ آپکو متعدد واقعات کا سامنا کرنا پڑا، اور معاویہ نے عراقیوں کی حالت دیکھ کر باقاعدہ صلح کی پیش کش کر دی۔ اور یہ سوچا کہ اس طرح حسنؑ کا سارا لشکر منتشر ہو جائے گا، اور میں سب کو اپنی طرف کھینچ لوں گا، صلح میں اتنی فراخدلی کا مظاہرہ کیا کہ سادہ کاغذ بھیجدیا اور ہر شرط پر رضامندی کا اعلان کر دیا، امام حسنؑ نے حالات کا گہرا جائزہ لیا اور فوج کی بغاوت کے امکانات پر بھی نگاہ ڈالی لیکن آپ نے صلح پر رضامندی ظاہر کر دی اور یہ واضح کر دیا کہ میں فوج کی مرضی کی خاطر مرضی پروردگار کو پامال نہیں کر سکتا، کل جب نانا نے صلح کی تھی تب بھی لوگ مخالف تھے، جب بابا نے صفین کے بعد تحکیم پر سکوت اختیار کیا تھا جب بھی لوگ مخالف تھے اور آج بھی بغاوت ہوگی لیکن میں صلح کا دامن نہیں چھوڑ سکتا آپ نے صلح نامہ مرتب کر دیا اور جس طرح باپ نے تحکیم میں کتاب خدا کو حکم بنایا تھا اسی طرح بیٹے نے بھی دو بنیادی شرطیں رکھیں پہلی شرط یہ ہے کہ حاکم شام کو کتاب و سنت پر عمل کرنا ہوگا اور دوسری شرط یہ ہے کہ امیر المومنینؑ پر سب و شتم کے سلسلے کو بند کرنا پڑے گا۔ صلح نامہ مرتب ہو گیا، حاکم شام نے قبول بھی کر لیا، امام حسنؑ نے تخت و تاج چھوڑ دیا اور فوج میں حسب توقع بغاوت پھیل گئی۔ لوگوں نے مومنین کو ذلیل و رسوا کرنے کا الزام لگانا شروع کر دیا اور فرزند رسولؐ نانا کی سیرت پر عمل کرکے مطمئن رہا۔

واقعہ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور ہر مقام پر

مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ شام کے حاکم نے سادہ کاغذ بھیج کر واضح کر دیا کہ امام حسنؑ کوئی غلط اقدام نہیں کر سکتے اور امام حسنؑ نے بھی شرائط لکھ کر نادان مسلمانوں کی زبان بند کر دی کہ خبردار! اب مجھ پر معاویہ کی بیعت کرنے کا الزام نہ لگانا میں نے معاویہ کی شرائط پر عمل نہیں کیا ہے، معاویہ سے اپنے شرائط پر عمل کرایا ہے، اب اگر صلح کوئی بیعت ہے تو نبیؐ کے لال نے بیعت لی ہے۔ بیعت کی نہیں۔ صلوات۔

دوسری طرف معاویہ کے صلحنامہ کو روند دینے سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ فریبکار حکومت ہے، امامت نہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب یہ سوال اٹھا کہ امام حسنؑ حکومت شام کے مقابلہ میں دھوکہ کھا گئے اور انھیں حالات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا تو امامت کی جلالت نے مسکرا کر آواز دی کہ خدا کا شکر ہے کہ دھوکہ کھایا ہے دھوکہ دیا نہیں: نادانو! اسلام میں دھوکہ دینا جرم ہے دھوکہ کھانا کوئی جرم نہیں ہے۔ صلوات،

صلحنامہ میں امام حسنؑ نے کتاب خدا پر عمل کرنے کی شرط لگا کر واضح کر دیا کہ اگر حکومت شام کتاب و سنت پر عامل ہوتی تو مجھے شرط لگانے کی ضرورت نہ پڑتی، میں نے شرط اسلئے لگائی ہے کہ شام کی حکومت سے دستخط کرا کے اس کے طرز حکومت کو واضح کر دوں اور اس کے کتاب و سنت سے الگ ہو جانیکا اقرار لے لوں۔ اب بتلاؤ کہ میرے بابا یا حبیبا بھی صلح کر کے کچھ کھویا ہے یا کچھ پایا ہے۔ صلوات۔

سب و شتم کے بند کرنے کی شرط بھی اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ شام میں یہ سلسلہ جاری ہے ورنہ مجھے بند کرانیکی ضرورت نہ پڑتی، اب کوئی بنی امیہ کا نمک خوار یہ نہیں کہہ سکتا کہ شام کی حکومت نے علیؑ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا اور غلامان علیؑ اگر غاصب حکومتوں پر تنقید کرتے ہیں تو یہ ان کی کوئی ایجاد یا بدعت ہے۔ نہیں نہیں! یہ انداز حکومت شام پہلے اختیار کر چکی ہے۔ غلامان علیؑ پہل نہیں کرتے لیکن جواب دینے میں کہیں بند بھی نہیں ہوتے،

حکومت شام نے بروقت ان حالات کا اندازہ نہیں کیا لیکن چند ہی دنوں میں یہ محسوس کر لیا کہ اس صلح میں حکومت کو گھاٹا ہوا ہے اور امام حسنؑ نے صلح کر کے تیسرا بیعت کی تجدید کر دی ہے۔ اب کسی مسلمان کو ان کی صلح پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے، البتہ میری خلاف ورزی پر اعتراض کرنے کا حق ہے۔ اس لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ انکی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور توہین و ذلت کا یہ سلسلہ بند ہو جائے۔ حکومت کیلئے یہ کام کوئی اہم کام نہیں تھا، امیرالمومنینؑ اپنی زندگی میں فرما گئے تھے کہ حاکم شام مجھ سے زیادہ ہوشمند نہیں ہے لیکن کیا کروں میرے اقدامات میں دین حائل ہو جاتا ہے اور اسے دین کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے آپکی ایک زوجہ جعدہ بنت اشعث سے ساز باز کی اور ایک لاکھ درہم انعام کے عوض آپکو زہر دلوا دیا۔ زہر اپنا کام کر گیا اور امام حسنؑ دنیا سے انتقال فرما گئے لیکن دنیائے انصاف پر واضح ہو گیا کہ مظلومیت امامت کا شعار ہے اور ظلم و ستم حکومت کا کردار، امامت اسلام کے نام پر باپ کے قاتل سے بھی صلح کر سکتی ہے اور حکومت تخت و تاج کے لئے صلح کے بعد بھی زہر دے سکتی ہے۔

زہر دیا گیا اور زہر کا اثر پھیلا، عالم یہ تھا کہ امام حسنؑ کا جسم اقدس سبز ہو گیا اور ایک غشی کی کیفیت طاری ہو گئی، بہن زینبؑ قریب بیٹھی تھیں اعزا و اقرباء کا مجمع تھا کہ ایک مرتبہ قے ہونے لگی اور بہن نے دیکھا کہ بھائی کے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر لگن میں آ رہے ہیں، کون بہن ہو گی جو اس منظر کو دیکھ سکے مگر اللہ رے زینبؑ کا حوصلہ، مدینہ میں بھائی کے جگر کے بہتر ٹکڑے دیکھے اور کربلا میں بھائی کے ساتھیوں کے بہتر لاشے دیکھے، یہاں بھائی کو موت کے بستر پر دیکھا اور وہاں بھائی کو شمر کے خنجر کے نیچے دیکھا لیکن زبان فریاد کی نہ ہاں بددعا کے لئے ہاتھ اٹھے، ہاتھ اٹھے بھی تو دعا کے لئے۔ پروردگار میرے حسینؑ کی قربانی قبول کر لے۔

امام حسنؑ کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا، امام حسینؑ بے سہارا ہوگئے، قاسمؑ و عبداللہؑ یتیم ہوگئے، ام فروہ کے سر سے وارث کا سایہ اٹھ گیا، زینبؑ بھائی سے جدا ہوگئیں، ام کلثومؑ کا سہارا ٹوٹ گیا، تھوڑی دیر کے بعد جنازہ تیار ہوا، امام حسینؑ حسب وصیت جنازہ کو لے کر قبر رسولؐ کی طرف چلے، بنی امیہ نے راستہ روکا، ایک خاتونؑ نے بنی امیہ کی قیادت کی اور ہاشمی شیروں کے غیظ و غضب کو دیکھ کر ظالموں نے تیروں کی بوچھار شروع کردی، امام حسینؑ نے بھائی کی وصیت کے مطابق ہاشمی جوانوں کو روکا اور جب جنازہ رکھا گیا تو متعدد تیر جنازہؑ میں پیوست پائے گئے، میں نہیں جانتا کہ بھائی پر کیا گزر گئی اور محمد حنفیہؑ اور عباسؑ جیسے بہادروں نے کیسے برداشت کیا لیکن اللہ رے صبر و استقلال کہ ان مصائب کے باوجود جنازہؑ کو واپس لاکر بقیع میں دفن کردیا۔

میں کہوں گا مولا حسینؑ ہماری جانیں قربان، اے صبر و حوصلہ بھائی کے جنازہ میں تیر دیکھے اور آہ نہ کی لیکن مولا تیر دیکھ کر صبر کرنا آپکا کام تھا اور تیروں پر جسم نازنین کو معلق دیکھ کر صبر کرنا آپکی بہن زینب کا کام تھا، اللہ اللہ وہ عصر کا ہنگام، وہ زمین کربلا کا زلزلہ، وہ حسینؑ کا زخمی ہوکر گھوڑے سے گرنا، وہ تیروں پر جسم نازنین، وہ شمر ملعون کا خنجر، وہ فاطمہ زہراؑ کی فریاد، وہ فضائے کربلا کی آواز اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا

حسن مجتبیٰؑ کی شہادت پر امام حسینؑ روئے، نظم سنایا، مرثیہ پڑھا، لیکن مجھے کہیں نہیں ملا کہ شدت غم میں یہ کہدیا ہو کہ بھیا آپکے مرنے سے میری کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہوگئی، عجب نہیں مصلحت یہ رہی ہو کہ ابھی میرا عباسؑ زندہ ہے، میری کمر مضبوط ہے لیکن جب کربلا میں مقتل سے آواز آئی تو حسینؑ کے ہاتھ کمر تک پہنچ گئے، بھیا عباسؑ تمہارے مرنے سے کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہوگئی، بھیا! دشمن طعنے دے رہے ہیں کہ علمدار کہاں ہے؟ عباس اٹھو، میں دشمنوں کو کیا جواب دوں۔؟.... میرے بھیا....!

عزادارو! بیان آخری منزل تک آگیا ہے، ایک جملہ کہہ کے مجلس کو تمام کر دینا چاہتا ہوں، صاحبانِ اولاد کا مجمع ہے، ایک لمحہ کے لئے سوچیں، آل محمدؐ کے لئے سارے صدمے ایک طرف ہیں اور کمسن بچے کی یتیمی کا خیال ایک طرف۔ ہائے وہ ماں کیا کرے جس کا دو برس کا بچہ یتیم ہوگیا ہو، وہ بی بی کیا کرے جس کی آغوش میں مرحوم شوہر کی یادگار ہو، اور حسرت سے باپ کے جنازہ کو دیکھ رہی ہو، وہ اپنے والی کا ماتم کرے یا اپنے کمسن بچے کو بہلائے، غم والم کی ماری خاتون اپنے حالات کا مرثیہ پڑھے یا اپنے بچوں کو لوریاں دے، کون سمجھ سکتا ہے کہ یہ غم کیسا ہے اور ام فروہ کے دل پر کیا گزر رہی ہے لیکن میں اتنا عرض کروں گا کہ بی بی آپ پریشان نہ ہوں، خدا رکھے ابھی حسینؑ کا سایہ قائم ہے، ابھی عباسؑ جیسا جوان موجود ہے، ابھی تسکین دینے کے لئے شہزادی زینبؑ ہیں، ابھی بچوں کو بہلانے کے لئے بی بی ام کلثومؑ ہیں، ابھی خواتین کا مجمع ہے، ابھی ہاشمی گھرانے کی عورتیں موجود ہیں، بی بی! ابھی غم ایک ہے اور غمگسار بہت ماتم ایک ہے اور ماتم دار بہت، صدمہ ایک ہے اور تسکین دینے والے بہت، مگر اس وقت کیا کیجئے گا جب سارا ماحول غمزدہ ہوگا، جب بی بی کو دیکھا کسی کی مانگ اجڑ گئی، کسی کی گود خالی ہوگئی، کسی کا جوان بیٹا مارا گیا، کسی کا بھائی شہید ہوگیا، کسی کا سقا ذبح ہوگیا کسی کا فدیہ میدان سے پلٹ کر نہیں آیا، ہر طرف غم، ہر طرف مصیبت، ہر طرف لاشیں، ہر طرف کوہِ الم، ایسے میں جب آپ کے لال کا پامال جنازہ آئے گا تو کیا کیجئے گا، اور جب مقتل میں آپ کی گود کے پالے کے ہاتھ چچا پر قربان ہوں گے تو کیا عالم ہوگا، اور بی بی! آج آپ کا کمسن فرزند یتیم ہوا ہے تو خدا رکھے تسکین دینے والے ہیں، بہلانے والے ہیں، گود میں کھلانے والے ہیں، مگر بی بی! جب کربلا میں سکینہؑ یتیم ہوگی تو اس وقت کا عالم ہی عجیب ہوگا، نہ کوئی تسکین دینے والا، نہ کوئی پرسہ دینے والا

گھر میں رہے تو خیمہ میں آگ، نکلنا چاہے تو دامن میں آگ، خاک پر بیٹھ جائے تو ظالموں کے طمانچے اور گھبرا کر باپ کی لاش کے قریب آجائے تو شمر ملعون کے تازیانے، زمین کربلا کا زلزلہ، سکینہ کی فریاد، بابا شمر نے طمانچے مارے، بابا چادریں چھن گئیں، بابا گوشوارے اتار لئے گئے، بابا خیموں میں آگ لگ گئی، بابا آپ سو گئے ہیں اور سکینہ جاگ رہی ہے، بابا وہ سینہ کہاں ہے جس پر میں سویا کرتی تھی، یہ آپ کے سینے پر تیر کیسے ہیں، یہ آپ کا جسم زخمی کیوں ہے، بابا! یہ آپ کے جسم پر سر کیوں نہیں ہے؟ بابا.....

اُف وہ بچی جو اندھیروں میں سحر ڈھونڈتی تھی
باپ کی لاش سے لپٹی ہوئی سر ڈھونڈتی ہے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

جناب امام حسین علیہ السلام

اسم مبارک	:	حسینؑ ،
لقب	:	سید الشہداءؑ ،
کنیت	:	ابو عبد اللہ ،
والدہ ماجدہ	:	جناب فاطمہؑ ،
والد ماجد	:	حضرت علیؑ ،
ولادت	:	۳ شعبان المعظم ۴ھ ،
ازواج	:	پانچ ،
اولاد	:	چھ ،
شہادت	:	۱۰ محرم ۶۱ھ ،
عمر شریف	:	۵۷ سال ،
قبر مطہر	:	کربلائے معلیٰ ،

پانچویں محفل

داستان عظمت کار سید الشہداءؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین۔ اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے۔ بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ مالکِ کائنات نے انسان کی ہدایت کی ذمہ داری اس کے سر نہیں ڈالی اور اسے بے مہار نہیں بنایا بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی راہنمائی کا انتظام کیا ہے اور حیات کے ہر شعبہ میں اس کے لئے قواعد و قوانین وضع کر دیئے ہیں۔ اب یہ انسان کے اختیار کی بات ہے کہ وہ خدائی اہتمام پر اعتماد کرے یا اپنے لئے الگ سے کوئی نظام ہدایت معین کر لے۔ الٰہی نظام پر اعتماد کرنا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس کے لئے بے شمار قربانیاں دینی پڑتی ہیں، نفس کو پامال کرنا پڑتا ہے، زندگانی دنیا کو تباہ کرنا پڑتا ہے بلکہ دنیا کو خیرباد کہنا پڑتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بظاہر اپنا ہو کے بھی دوسرے کا ہو جانا پڑتا ہے نہ انسان کا کوئی ارادہ رہ جاتا ہے، نہ اختیار، نہ خواہش رہ جاتی ہے نہ پسند، نہ مرضی رہ جاتی ہے نہ مشیت، اب جو منشاء الٰہی چاہے وہی اپنی پسند ہے، اور جس پر اس کی نظر عنایت پڑ جائے وہی اپنا منظور نظر ہے۔

سرکار سید الشہداءؑ نے سرزمین کربلا پر قدم رکھنے کے بعد اسی نکتہ کیطرف اشارہ کیا تھا، لوگ بندگانِ دنیا ہیں، دین تو فقط زبانوں پر چڑھا ہوا ہے، جب تک دنیا سلامت رہتی ہے دین کا نام لیتے ہیں اور جب دنیا خطرہ میں پڑ جاتی ہے تو دین کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں. امام حسینؑ سے بہتر اس حقیقت کا جاننے والا کون ہو سکتا ہے، آپ کے پاس علم امامت بھی ہے اور تجربہ حیات بھی. آپ نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور انھیں سمجھانا چاہا ہے جن کی آنکھیں بند ہیں اور جو دنیا سے یکسر غافل ہو گئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ الٰہی نظام پر ایمان لانے اور نہ لانے میں وہی فرق ہے جو کربلا میں حسینیت اور یزیدیت میں تھا، نظام الٰہی کے ذمہ دار کا نام حسینؑ بن علیؑ تھا اور نظامِ دنیا کے پرستار کا نام یزید بن معاویہ اور حقیقت اسی لئے واضح کی گئی تھی کہ دنیا کربلا کی جنگ کو دو بادشاہوں کی جنگ نہ کہہ دے اور یہ خوب سمجھ لے کہ یہ ایمان و نفاق کا معرکہ ہے، اسلام و کفر کی جنگ ہے عبدیت اور بے راہ روی کا معرکہ ہے، آدمیت اور اہلبیت کی لڑائی ہے. محمدیت اور سفیانیت کی محاذ آرائی ہے، محمدیت کے نمائندہ کا نام حسینؑ اور سفیانیت کے بقیۃ السلف کا نام ہے یزید۔

سرکار سید الشہداء امام حسین علیہ السّلام کے بیان کا حوالہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ آج کے اس مقدس اجتماع میں اسی عظیم شخصیت کا تذکرہ کرنا ہے اور مختصر لفظوں میں اسی ہستی کے حالات و کردار پر روشنی ڈالنا ہے، امام حسینؑ کے کردار کے لئے سید الشہداء کا لفظ ہی بہت کافی ہے اور میرا خیال ہے کہ روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی لقب نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں

ذ طرح کے القاب وخطابات پائے جاتے ہیں۔ بعض الفاظ نقص، عیب، کمزوری اور برائی کی علامت ہیں۔ جیسے شیطان، ابلیس، جاہل، فاسق، کافر، بدکار، عیاش وغیرہ کہ ان الفاظ کے سنتے ہی ذہن برائی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ ان الفاظ کا مصداق یقیناً کوئی بے ایمان اور بدکردار آدمی ہوگا اور بعض الفاظ سے اچھائی اور خوبی کا تصور قائم ہوتا ہے جیسے مومن، مظلوم، نبی، امام، خلیفۃ اللہ، رشی، منی، اوتار اور اس طرح کے دوسرے بے شمار الفاظ جن کے سننے کے بعد یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی اپنی قوم اور اپنی ملت کا محترم اور باعزت آدمی ہے۔ اس کے کردار میں کوئی نہ کوئی حسن اور خوبی ضرور ہے ورنہ اسے اس مقدس نام سے نہ یاد کیا جاتا۔ لیکن ان دونوں قسم کے الفاظ کے ساتھ ایک خصوصیت ہے کہ بعض الفاظ جماعتی اور قومی اعتبار سے فضیلت و منقصت رکھتے ہیں اور بعض الفاظ ہر قوم اور ہر جماعت میں حسن یا عیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر نبی یا امام مسلمانوں میں عظمت کی علامت ہے ہندوؤں میں نہیں۔ اوتار یا رشی منی ہندوؤں میں بلندی کی دلیل ہے مسلمانوں میں نہیں۔ یہی حال ابلیس و شیطان، فرعون و قارون جیسے الفاظ کا ہے کہ یہ الفاظ ایک طبقہ کے لئے عیب کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک طبقہ میں یہی حسن ہیں۔ ابلیس، اللہ والوں کی نگاہ میں عیب ہے اور توحید خالص والوں کیلئے بہترین حسن ہے کہ ایک ایسا بندہ بھی پیدا ہوا ہے جس نے غیر خدا کے سامنے سر نہیں جھکایا اگرچہ خدا ہی نے حکم دیا تھا۔ فرعون و قارون موسیٰ کے پرستاروں کی نگاہ میں عیب ہے۔ بنی اسرائیل کی نگاہ میں خدائی کی علامت تھا۔ غرضکہ دنیا میں اچھائی کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں اور برائی کی علامتیں بھی۔ اور

آج کے دور میں تو پورا ایک ادب علامتوں پر قائم ہے، آج کون علامت کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علامت کی دو قسمیں ہیں وہ علامتیں جو کسی ایک قوم، طبقہ، جماعت یا گروہ میں عظمت کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ علامتیں جو ہر قوم، ہر ملت، ہر طبقہ اور ہر گروہ میں عظمت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لفظ بین الاقوامی علامت کا حامل ہوگا وہ ان تمام الفاظ سے بالاتر ہوگا جن کی علامتیت صرف فرد، جماعت یا قوم سے وابستہ ہوگی اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخِ انسانیت میں "شہید" کا لفظ جملہ علامتوں سے بالاتر ہے، لفظ خدا علامت خیر ہے لیکن مسلمانوں میں، لفظ نبی و امام و خلیفہ علامت خیر ہے لیکن اللہ والوں میں، لفظ اوتار، رشی، پیغامبر، رشی، منی، گرو علامت خیر ہے لیکن ایک محدود طبقہ اور جماعت میں۔ لیکن لفظ "شہید" ایک ایسی علامت ہے جسے دنیا کی ہر قوم اپنائے ہوئے ہے اور اپنانے کے لئے تیار ہے۔ آج دنیا کے حالات کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ لفظ شہید اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سیاسی میدان کے مرنے والے بھی شہید، روٹی کپڑے کے سوال پر قتل ہونے والے بھی شہید، ظالموں کے ساتھی بھی شہید، مظلوموں کے ہمراہی بھی شہید، حملہ آور بھی شہید، مجروح اور مظلوم بھی شہید، غرضکہ جس کے سینے پر گولی لگی وہ شہید، جس کے گلے پر خنجر چلا وہ شہید، جسے سولی پر چڑھایا گیا وہ شہید، جس کی زندگی کا خاتمہ کیا گیا وہ شہید، شرط صرف یہ ہے کہ کسی جرم و خطا پر نہ مارا گیا ہو ورنہ مقتول ہوگا شہید نہ ہوگا۔ گویا ساری دنیا نے اتفاق کر لیا ہے کہ شہادت کے لئے نیک کردار ہونا ضروری ہے اور شہید وہی انسان ہوگا جو بلند مقصد پر

قربان ہو جائے، چاہے اس کا مقصد کسی ایک جماعت اور گروہ کی نظر میں بلند ہو، اور جب یہ حقیقت واضح ہو گئی تو مجھے کہنا پڑے گا کہ علامتی میدان میں لفظ شہید ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی عظمت سے دنیا کا کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا، شاید یہی راز رہا ہو کہ پروردگار نے اپنے جملہ نمائندوں کی شہادت مقدر کر دی اور یہ چاہا کہ یہ دنیا سے جانے کے بعد بھی منزلِ عظمت پر فائز رہیں، بلکہ انکی عظمت ہر قوم و ملت میں مسلم رہے، یہ اور بات ہے کہ ان میں اکثر شہادتیں وہ ہیں جنھیں پسِ پردہ ڈال دیا گیا، اور دنیا کو ان کی اطلاع بھی نہ ہو سکی، یا شہادت کی اطلاع ہوئی تو اسباب پردۂ راز میں رہ گئے اور نوعیتِ قتل کے مجہول ہو جانے کی بنا پر شہادت کا صحیح فیصلہ نہ ہو سکا امیرالمومنینؑ بھی شہید ہوئے اور امام حسن مجتبیٰؑ بھی، حضور اکرمؐ بھی شہید ہوئے اور صدیقہ طاہرہؑ بھی، امام زین العابدینؑ بھی شہید ہوئے اور امام محمد باقرؑ بھی، امام صادقؑ بھی شہید ہوئے اور امام کاظمؑ بھی، امام رضاؑ بھی شہید ہوئے اور امام تقیؑ بھی، امام نقیؑ بھی شہید ہوئے اور امام عسکریؑ بھی لیکن ان میں اکثر شہادتیں وہ ہیں جن پر پردہ پڑا ہوا ہے اور دنیا انھیں مشکوک بنائے ہوئے ہے۔ ہاں ایک شہادت ایسی ہے جس پر کوئی پردہ نہ پڑ سکا اور نہ پڑ سکتا تھا، قدرت نے اس کے لئے خاص انتظام کیا تھا، انبیاء و مرسلین کے دور سے اس کا اعلان ہوا تھا، خاتم النبیینؐ کی زبان سے تکرار ہوتی تھی، حسن مجتبیٰؑ کے بیانات سے اظہار ہوا تھا اور پھر عملی طور پر مدینہ چھوڑ کر، مکہ کو ترک کر کے، کوفہ سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک صحرا کا انتخاب کیا گیا، بچوں کو ساتھ لیا، عورتوں کو رفیقِ سفر بنایا، قافلہ تیار کیا، رفقاء و احباب فراہم کئے اور اس کے بعد شہادت کا موقع دیا۔ تاکہ کسی دور میں اس شہادت پر پردہ نہ پڑ سکے اور کوئی حکومت اسے دبا نہ سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر راہِ حق میں قربانی دینے والا شہید ہوا اور امام حسینؑ

سید الشہداء ہو گئے، سب کی عظمتوں پر پردے ڈال دیئے گئے لیکن حسینؑ کی عظمت اقوامِ عالم میں مسلم ہو گئی اور اسی شہادت کا طفیل تھا کہ جو خدا اور رسولؐ کے پرستار نہیں بنے وہ بھی حسینؑ کے قدموں میں سر جھکائے ہوئے ہیں۔ جو اسلام اور ایمان کو نہیں پہچانتے وہ بھی حسینی برہمن کہے جاتے ہیں اور حسینؑ آواز دے رہے ہیں، میرے چاہنے والو! میں ایک نانا کا نواسہ اور ایک خدا کا نمائندہ ہوں، تم میرے قدموں تک آ جاؤ میں تمہیں خدا تک پہنچا دوں گا۔ خبردار! میری منزل تک آ کر ٹھہر نہ جانا ورنہ تمہاری معرفت مجروح ہو جائے گی، دیکھو میں نے تمہاری ہدایت کا کتنا معقول انتظام کیا ہے کہ جب ساری دنیا میری طرف متوجہ تھی تو میں خاکِ گرم پر سجدہ کر رہا تھا تاکہ سب میری طرف آئیں اور میں خدا کی طرف لے جاؤں، صلوات،

یہ ہے عظمتِ حسینؑ، جو صرف حسینؑ کا حصہ ہے اور جس میں کوئی دوسرا شریک اور حصہ دار نہیں ہے اور جسے خدا نے بھی اہمیت دی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ اے حسینؑ میں نے تجھے شہادت کے عوض تین فضیلتیں عنایت کی ہیں، شفا تیری تربت میں رکھی ہے، قبولیت دعا تیرے روضہ پر رکھی ہے اور امامت کو تیری نسل میں قائم کر دیا ہے۔

اب کون پوچھے کہ حسینؑ کی عظمت و منزلت کیا ہے، خدا شفا، قبولیت اور امامت دے رہا ہے، رسولؐ سجدہ میں پشت پر بٹھائے ہوئے ہیں، عیدین کاندھے پر اٹھا رہے ہیں، گھر میں زبان چُسا رہے ہیں، محفل میں پیار کر رہے ہیں، محراب میں سجدہ کو طول دے رہے ہیں، منبر پر فضائل کا اعلان کر رہے ہیں، ازواج کے گھر شہادت کی داستان سُنا رہے ہیں، اصحاب کی محفل میں مودت کا سبق دے رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا بھی عظمتِ حسینؑ کے اعلان پر

آمادہ ہے اور رسول اکرمؐ بھی اور کیوں نہ ہوتا دونوں کو معلوم ہے کہ میرے نام کی بقاؑ حسینؑ سے ہے، خدا کو معلوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ حسینؑ کے دم سے باقی رہے گا، نبیؐ کو معلوم ہے کہ محمد رسول اللہ کا کلمہ حسینؑ ہی زندہ رکھے گا۔

سر داد نداد دست در دست یزید ؛ حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

۳ شعبان سنہ ۴ھ کی تیسری تاریخ تھی جب یہ زہراؑ کا چاند افق امامت پر نمودار ہوا، اور ام الفضل کو اپنے خواب کی تعبیر ملی، ولادت میں بھی قدرت نے ایک خاص اہتمام رکھا کہ زہراؑ کے اس فرزند کو شکم مادر میں صرف چھ ماہ رکھا اور اس کے بعد ایک طول حیات عنایت کی جبکہ دنیا جانتی ہے کہ بچہ شکم مادر میں کم از کم نو ماہ کی مدت گزارتا ہے اور چھ ماہ کی مدت میں پیدا ہونے والا بچہ زندہ نہیں رہتا۔ لیکن تاریخ کا بیان ہے کہ یہ امتیاز قدرت نے صرف جناب یحییٰؑ اور امام حسینؑ کو عنایت کیا تھا، کہ چھ ماہ کی مدت میں خلق کیا اور زندہ بھی رکھا اور شاید اسی لئے امام حسینؑ اکثر جناب یحییٰؑ کا تذکرہ کرتے تھے اور دونوں کے واقعات میں ایک حد تک مشابہت و مناسبت بھی پائی جاتی تھی، بعض حضرات نے اس ذیل میں جناب عیسیٰؑ کا نام بھی لیا ہے۔ لیکن مجھے اس سے بحث نہیں ہے، مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قدرت نے امام حسینؑ کو ولادت ہی سے ایک امتیاز دیا ہے، باپ مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالب، ماں خاتون قیامت صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ، نانا خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نانی خدیجۃ الکبریٰؑ بھائی امام حسنؑ مجتبیٰ، دادی حضرت فاطمہؑ بنت اسد، ہر طرف کمال، ہر رخ پر فضیلت، ہر جہت سے عظمت اور ہر اعتبار سے بلندی، ایک بھائی کے امام ہوتے ہوئے امامت ملی اور سارے انبیاء و مرسلین کی وراثت میں شہادت ملی، سلام ہو تجھ پر اے آدمؑ کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے نوحؑ کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے ابراہیمؑ

کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے محمد مصطفٰےؐ کے وارث۔

منزلِ ولادت میں مدت کے مختصر رکھنے میں شاید یہ اشارہ رہا ہو کہ میرے حسینؑ میں نے عام بچوں سے ہٹ کر تیری ولادت کو مختصر رکھ کر بھی تجھے طویل حیات دی ہے، اب تیری ذمہ داری ہے کہ اگر میرے دین پر وقت پڑ جائے تو مختصر مدت میں قربانی دیکر میرے دین کو دائمی حیات دیدینا، حسینؑ نے بھی طے کر لیا کہ پروردگار تو نے مجھے چھ ماہ کی مدّت میں حیات دی ہے تو میں بھی اپنے چھ ماہ کے بچّہ کو قربان کر کے تیرے دین کو ہمیشہ کیلئے دوام دے دوں گا۔

ولادت کی خبر پاکر مرسلِ اعظمؐ بیت الشرف زہراؑ میں تشریف لائے، آواز دی میرے بچّے کو لاؤ، جناب صفیہ خواہر جناب حمزہؑ نے عرض کی حضور ابھی بچہ کو غسل نہیں دیا گیا، اسے طیب وطاہر بنالوں تو لاؤں۔ فرمایا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا میرے بچّے کو بھی طہارت کی ضرورت ہے، جلدی لائیے، جسے اللہ نے طیب وطاہر بنایا ہے اسے غسل وطہارت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دیکھا آپنے! قدرت نے اپنے نمائندہ کو کیسا طیب وطاہر بناکر بھیجا ہے کہ غسل مولود کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ غسل مولود ایک امر مستحب ہے واجب نہیں۔ اسے طہارت ونجاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی ذمہ داری انسان پر ہے، اور اس کے برخلاف غسلِ میت واجب ہے، موت کے بعد انسان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے غسل دینا واجب ہوجاتا ہے، نبی اور امام کے یہاں یہ کیفیت بھی نہیں پیدا ہوتی لیکن قانون کو جاری رکھنے کے لئے ان کے یہاں بھی غسل میت ہوتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ غسل بربنائے نجاست نہیں ہے یہ اہتمام کیا جاتا ہے

پیر غیر معصوم کو ہاتھ نہیں لگانے دیا جاتا، تاکہ دنیا پہچان لے کہ اگر موت سے نجاست پیدا ہوگئی ہوتی تو ہر کس و ناکس کو غسل دینے کا اختیار ہوتا، لیکن یہاں موت نے اتنا طیب و طاہر بنا دیا ہے کہ زندگی بھر غیر معصوم کو ہاتھ لگانے کا اختیار تھا مرنے کے بعد اب وہ اختیار بھی نہیں رہ گیا۔

اب پہچانا آپ نے کہ امام کی منزل کیا ہوتی ہے۔ اور اس کی حیات و موت کا قدرت نے کیا اہتمام کیا ہے لیکن مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ قدرت نے یہاں بھی امام حسینؑ کی ایک خصوصیت عنایت کی کہ ہر معصوم کے یہاں کسی نہ کسی بنیاد پر غسل میت برقرار رکھا، امام حسینؑ کو شہادت کا درجہ دے کر اس غسل سے بھی الگ کر دیا، آغاز میں غسل ولادت سے بھی الگ رکھا اور انجام میں غسل میت سے بھی الگ کر دیا۔ اب دیکھئے کہ حسینؑ کی طہارت کیسی ہے؟ اور اس طہارت کا مزاج کیسا ہے؟۔ یہاں کسی غسل کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا آغاز بھی طیب و طاہر ہے اور اس کا انجام بھی طیب و طاہر۔

مجھے وضو و غسل کی بحث میں نہیں جانا ہے ورنہ اس کے بارے میں بھی عرض کرتا۔ اور ان تمام شبہات کی طرف اشارہ کرتا جو اکثر ذہنوں میں پائے جاتے ہیں، اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میری بحث ان غسلوں سے ہے جن کا تعلق انسان کے ذاتی وجود سے ہے اور میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آل محمدؐ ذاتی طور پر طیب و طاہر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ نہ ان کے آغاز وجود میں کسی نجاست کا تصور ہے نہ انجام وجود میں، مجھے عارضی مسائل سے بحث کرنا نہیں ہے ورنہ ان پر بھی روشنی ڈالتا۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آیت تطہیر کے دائرہ کی وسعت پر بحث کرنے والے نبیؐ کا یہ فرمان سنیں، صفیہ جلدی لاؤ، میرا بچہ طاہر ہے، اسے طہارت کی ضرورت نہیں ہے" دنیا پاک کرنے اور پاک رکھنے کی بحث میں پڑی ہوئی ہے اور پیغمبرؐ واضح کر رہے ہیں

کو میرے اہلبیتؑ پیدا ہی طیب و طاہر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں پاک کرنے اور نجس کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

انفرادیت کا تذکرہ ہے تو چند خصوصیات کی طرف اور اشارہ کردیا جائے۔ امام حسینؑ کی زندگی میں اکثر ایسے واقعات پائے جاتے ہیں جن میں امام حسنؑ برابر کے شریک ہیں۔ جناب ام الفضل کا خواب۔ عید کے دن دوشِ رسولؐ پر سوار ہونا، سجدہ میں پشت پیغمبرؐ پر بیٹھنا، مباہلہ کے میدان میں جانا، آیت تطہیر میں شامل رہنا، سورہ دہر کے نزول کی منزل میں بیمار ہو کر نذر کرنا، کتابت کے فیصلہ میں حصہ لینا، ہرنی کے بچہ کا آجانا، فدک کا گواہ بن کر جانا، جنت کا سردار ہونا، لیکن اس کے باوجود ان واقعات کو انفرادیت ہی میں شمار کیا جائے گا، اس لئے کہ انفرادیت کا تعلق امت کے دوسرے افراد سے ہے ورنہ اہلبیتؑ تو آپس میں سب ایک دوسرے کی مثال ہیں، یہاں یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ کس میں کون سا کمال ہے اور کس میں کون سا کمال نہیں ہے۔ منزل اظہار میں فرق ہو سکتا ہے لیکن منزل کمال میں کسی فرق کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی میں بعض ایسی خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا جو پروردگار عالم نے خصوصیت کے ساتھ امام حسینؑ ہی کو عنایت کئے ہیں ان سے دوسرے ائمہ کی عظمت پر اثر نہیں پڑتا لیکن امام حسینؑ کی عظمت کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔

مسجد میں مرسل اعظمؐ ہیں۔ منبر پر تشریف فرما ہیں، مسائل شریعت کا بیان ہو رہا ہے، آیات قرآنی کی تلاوت ہو رہی ہے۔ احکام الٰہی پہنچائے جا رہے ہیں، کہ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے دیکھا چھوٹا شہزادہ چلا آرہا ہے۔ پیر دامن میں الجھا، بچہ زمین پر گرا، پیغمبرؐ نے خطبہ قطع کیا، منبر سے اترے اور بچے کو منبر پر لیا کر نئے سرے سے بیان شروع کیا۔ مسلمانو! اسے پہچانو، یہ میرا حسینؑ ہے۔ اس کی

معرفت حاصل کرو، اس کے فضائل پہچانو اور وقت پڑ جائے تو اس کی مدد بھی کرنا۔

کہاں سرکار دو عالم کا خطبہ، حلال و حرام شریعت کا بیان، احکام الٰہی کی تبلیغ اور کہاں بچہ کا گرنا، بھلا اس گرنے کی اہمیت کیا ہے، بچے گرتے ہی رہتے ہیں، اصحاب کا مجمع تھا، حضور کسی کو اشارہ کر دیتے وہ بچہ کو بڑھ کر اٹھا لیتا، یہ خطبہ کو قطع کرنے کی کیا ضرورت تھی، یہ منبر سے اترنے کی کیا ضرورت تھی، اور اگر اتر بھی آئے تھے اور بچہ کو اٹھا بھی لیا تھا تو منبر پر لے جانے کی کیا ضرورت تھی اور اگر لے بھی گئے تھے تو سارا بیان چھوڑ کر فضائل بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ عجیب نازک منزل ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہدوں کہ معاذ اللہ پیغمبرؐ نے غلط کیا ہے اور بچہ کی محبت میں بہک گئے ہیں تو اسلام جاتا ہے اور یہ کہدوں کہ حسینؑ کے پیر پھسل گئے اور گر گئے تو ایمان جاتا ہے، بھلا معصوم کے قدم میں لغزش کہاں ہو سکتی ہے، یہ کہدوں کہ پیغمبرؐ بیمار رہے ہوں گے اور مرض میں بہک کر حسینؑ کے فضائل بیان کرنے لگے تو مذہب ہاتھ سے جاتا ہے، کیا کہوں، کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہے، کیا یہ کہدوں کہ یہ سب صحیح تھا، حسینؑ کا آنا بھی صحیح تھا، صحن مسجد میں گرنا بھی صحیح تھا، رسولؐ کا خطبہ کو قطع کرنا بھی صحیح تھا، منبر سے اترنا بھی صحیح تھا، بچہ کو اٹھانا بھی صحیح تھا اور دوبارہ منبر پر جا کر فضائل بیان کرنا بھی صحیح تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان تمام امور کی ضرورت کیا تھی۔؟

یہ فضائل آل محمدؐ کی منزل ہے، اس کو سمجھنے کے لئے بڑا کلیجہ درکار ہے، یہ منزل ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، واقعہ میں جو کچھ ہو رہا تھا سب عین مشیت الٰہی اور مرضی پروردگار تھا، خدا چاہتا تھا کہ حسینؑ مسجد میں آ کر گریں، رسولؐ منبر سے اتر کر اٹھائیں اور پھر منبر پر جا کر بیان بدل کر حسینؑ کا تعارف کرائیں تاکہ دنیا پہچان لے کہ یہ

حسینؑ کی منزل کیا ہے؟ یہاں پیغمبر حدیث ہے اور میرا حسینؑ قرآن ہے اب قرآن حدیث کے سامنے آجائیگا تو حدیث کو رکنا پڑے گا اور قرآن کو مقدم کرنا پڑیگا رسول اسلامؐ نے منبر سے اتر کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اب کوئی منبر پر بیٹھنے والا اس قرآن ناطق کے سامنے حدیث کا نام نہ لے، یہ تو فقط انقلاب امت تھا، کہ چند ہی دنوں کے بعد قرآن ناطق کے مقابلہ میں حدیثیں پیش ہونے لگیں۔

ارباب کرم! ذرا غور کریں، صاحب حدیث اپنی حدیث کو روک کر حسینؑ کی بات کو آگے بڑھاتا ہے اور امتی حسینؑ کے سارے گھرانے کی بات کاٹ کر حدیث کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور حدیث بھی وہ جس کا کوئی "وارث" نہیں ہے، صاحب حدیث کی حدیث پیچھے ہٹ جائے اور "لاوارث" حدیث آگے بڑھ جائے یہ ہے امت اسلامیہ کا اسلام اور یہ ہے حسبنا کتاب اللہ کا نتیجہ۔

رسولؐ نے خطبہ قطع کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں نے موضوع بدلا نہیں، خبردار! یہ نہ کہنا کہ حلال و حرام شریعت کو چھوڑ کر حسینؑ کے فضائل شروع کر دیئے اور اپنے فرض تبلیغ سے ہٹ گئے۔ نہیں، نہیں، یہ حسینؑ کے کمالات بھی میری تبلیغ کا ایک جزو ہیں اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب تک جتنے احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں ان کا زندہ رکھنے والا حسینؑ ہی ہے، میرا اسلام تمہارے دم سے نہیں، حسینؑ کے دم سے زندہ رہے گا، میں نے حسینؑ کا تعارف اسلئے ضروری سمجھا ہے کہ لوگ میری شریعت کو لاوارث نہ سمجھیں یا اپنے ہی کو وارث نہ سمجھ لیں، میں نے خطبہ کو توڑ کر واضح کر دیا ہے کہ محمدیت کا وارث حسینؑ ہے کوئی دوسرا نہیں۔

سجدۂ رسولؐ میں بھی حسینؑ کی شان کچھ نرالی ہی ہے، مسلمانوں کا مجمع ہو،

نماز کا عالم ہے، بندگی کی منزل ہے، عبدیت کی معراج ہے، رسول اکرمؐ کا سجدہ ہے، اور پشت پر زہراؑ کا لال ہے، سجدہ کو طول دیا جا رہا ہے لیکن حسینؑ کو اتارا نہیں جاتا، کہا جاتا ہے کہ جبرئیل نے رسولؐ کے بازو تھام لئے، خبردار! جب تک میرا حسینؑ پشت سے نہ اتر جائے سجدہ سے سر نہ اٹھایئے گا، میں نہیں جانتا کہ جبرئیل آئے یا میکائیل، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ رسولؐ کی بشری زندگی کا واقعہ نہیں ہے کہ بچہ کی محبت کہہ کر ٹال دیا جائے، یہ عبادتِ الٰہی کا معاملہ ہے، شریعت اسلام کا مسئلہ ہے۔ سجدہ کی منزل ہے، اسے رسالت کا مسئلہ ماننا پڑے گا۔ اور رسالت کی منزل میں کوئی کام بغیر وحی الٰہی کے نہیں ہو سکتا جبرئیل نہ آئے ہوں کوئی اور آیا ہو، مجھے بحث کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ سجدہ کو طول وحی الٰہی سے ہو رہا ہے، رسالت کی منزل میں رسولؐ کا کوئی کام بغیر مرضیٔ پروردگار کے نہیں ہوتا، اب وحی الٰہی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ رسولؐ کو روک کر سارے نمازیوں کو مصیبت میں مبتلا کرے، یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ میں کون تبصرہ کرنے والا۔ میں تو صرف واقعہ جانتا ہوں کہ سجدہ کو طول ہوا اور جب سرکار نے سر اٹھایا تو مسلمانوں نے پوچھا۔ کیا خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔ فرمایا، نہیں! میرا حسینؑ میری پشت پر آگیا تھا، اب کوئی کہتا کہ اتار دیا ہوتا، گرا دیا ہوتا، یہ کوئی طریقہ ہے کہ آپ کے بچہ کے لئے ہم اتنی دیر تک سجدہ میں پڑے رہیں، یہ نماز ہے بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات ذہن میں آئے ہوں گے لیکن کسی میں بولنے کی جرأت نہیں ہے اور حسینؑ مسکرا رہے ہیں، آج کیسا سجدہ کرا دیا، نانا نے بھی خوب طول دیا اور امت کو بھی ہوش آگیا، اب تو دنیا

پہچانے گی میرا رتبہ کیا ہے۔ اور میرا منصب کیا ہے؟ یاد رکھو میں نماز میں جب آ جاتا ہوں تو سر منزل بہشت پر سواری ہوتی ہے اور میرا کام سجدہ کو طول دینا ہوتا ہے، دنیا پہچان لے میری منزل صاحب معراج کی پشت اقدس ہے اور میرا مقصد سجدوں کی زندگی ہے۔

خبردار! میرا بہانہ لے کر سجدوں کو ترک نہ کر دینا۔ سجدہ میری زندگی ہے سجدہ میری ادا ہے، سجدہ میری آرزو ہے، سجدہ میری آبرو ہے، جو عمر دنیا والوں میں کھیلنے کی ہوتی ہے اس وقت میں سجدہ کراتا ہوں اور جو عمر دنیا میں آرام کی ہوتی ہے اس وقت میں سجدہ میں سر کٹاتا ہوں۔

امت پر کیا گزر گئی یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن خدا نے طے کر لیا کہ جب تک حسینؑ پشت سے نہ اتریں گے نبیؐ کا سر سجدہ سے نہ اٹھے گا، کسی کو برا لگتا ہے تو لگے کوئی کڑھتا ہے تو کڑھے، کسی کے دل پر بجلی گرتی ہے تو گرے، ہم تو اپنے حسینؑ کے فضائل کا اظہار یوں ہی کریں گے، تمہیں حسینؑ کے عمل کی اہمیت نہیں معلوم، میں تو جانتا ہوں کہ یہ حسینؑ کیا ہے؟ اور اس کی عظمت کیا ہے؟ مجھے تو معلوم ہے کہ یہ آج پشت پر بیٹھ کر سجدہ کو زندگی دے رہا ہے اور کل کربلا کے میدان میں سجدہ کر کے رسالت کو زندگی عطا کرے گا۔

عزیزانِ محترم! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے فضائل اہلبیتؑ کے اظہار و اعلان میں ایک نیا ہی طریقہ اختیار کیا ہے، امت پر کیا گزر جائے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے، آل محمدؐ کے فضائل منظر عام پر آ جائیں، کسی سے برداشت ہو سکے یا نہ ہو سکے محفل میں زہراؑ کی تنظیم کی جائے گی، کوئی آنکھ دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے عید کے دن ناقہ بنایا جائے گا، کسی کے دل پر قیامت گزر جائے سجدہ کو طول دیا جائے گا اور کسی کے پیر میں چھالے پڑیں یا دل میں پھپھولے پھوٹیں غدیر کی دوپہر میں مجمع کو روک کر

ولایت علیؑ کا اعلان کیا جائے گا۔

یہ تو حسینؑ کی ذاتی ادائیں تھیں اور ان کے اپنے کمالات تھے، قدرت نے روز اول سے حسینؑ کو وہ رتبہ دیا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے' گویا قدرت یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ ہم نے اس فرزند کو کس خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے اور اس سے ایک عظیم کام لینا ہے' ایسا نہ ہوتا تو حسینؑ کی پوری تاریخ زندگی الفاظ قرآن میں بیان نہ ہوتی، ذرا آیت یاد کریں، ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرے' اس کی ماں نے زمانۂ حمل میں بھی مصیبتیں برداشت کی ہیں اور اسے دنیا کے حوالے کرنے کے بعد بھی' اس کے حمل اور دودھ پینے کا زمانہ ۳۰ مہینہ کا ہے' جب وہ انسان ۴۰ سال کا ہو گیا اور جسم میں توانائی آ گئی تو اس نے ہماری بارگاہ میں دعا کی' "پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عنایت کی ہیں' اور میری ذریت میں ایک صالح نسل پیدا کر میں تیری طرف متوجہ ہوں اور میرا سر تسلیم تیری بارگاہ میں خم ہے۔"

تاریخ اسلام بتلائے کہ وہ کون سا بچہ ہے جس کا حمل اور رضاعت کا زمانہ ۳۰ مہینے کا ہے، رضاعت کے دو سال نکالنے کے بعد شکم مادر میں چھ ماہ کون بچہ رہا ہے، جس کی ماں نے یہ سب زحمتیں برداشت کی ہیں کہ روز اول سے قتل و شہادت کی خبریں سن رہی ہے۔ جس نے اللہ سے دعا کی ہے اور آخری لمحات میں اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے، جس کے ماں باپ انعمت علیہم کی منزل میں ہیں' اور جس کی ذریت میں صالح نسل پیدا ہوئی ہے اور آج تک قائم ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کے سوا کوئی اس آیت کا مصداق نہیں ہے اور یہ صرف زہراؑ کے لال کا شرف ہے کہ قرآن حکیم نے اس کی پوری سوانح حیات ولادت سے لے کر نسل و ذریت تک بیان کر دی ہے اور اس نے بھی طے کر لیا ہے کہ خدا کی کتاب میری ولادت سے میری ذریت تک کے واقعات بیان کر گئی اور میں اسے نوکِ نیزہ پر سنا کر محفوظ کر دوں گا۔

اب نہ قرآن حسینؑ سے جدا ہو گا اور نہ حسینؑ قرآن سے، جب تک قرآن زندہ رہیگا تاریخ حسینؑ زندہ رہے گی اور جبتک نام حسینؑ زندہ رہیگا قرآن قائم و دائم رہے گا اور آخری دور میں قرآن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آئیگا تو وہ بھی فرزند حسینؑ ہی کے ذریعہ آئیگا۔

دنیا والوں نے نہیں پہچانا کہ حسینؑ کیا ہے؟ اور اس کی عظمت کیا ہے؟ آسمان والے پہچانتے ہیں کہ اس کی قدر و قیمت اور عظمت و جلالت کیا ہے؟ واقعات کہتے ہیں جب فاطمہؑ کے گھر اس فرزند کی ولادت ہوئی اور یہ خبر زمین سے آسمان تک پہنچی، جنت آراستہ ہوئی، کوثر کو جوش آیا، طوبیٰ نے موتی لٹائے، حوروں نے جشن منایا تو فرشتوں کا بھی ایک گروہ جبرئیل امین کی قیادت میں درِ زہراؑ پر مبارکباد کیلئے حاضر ہوا۔ راستہ میں ایک جزیرے سے گزر ہوا، دیکھا کہ اللہ کا ایک معتوب فرشتہ فطرس پڑا ہوا ہے۔ وجہ عتاب یہ ہے کہ فطرس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں بھی ایک بڑی مخلوق ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت کچھ عنایت کیا ہے اور اللہ کو یہ ادا پسند نہیں آئی۔

جبرئیل کی نظر پڑی، ٹھہر گئے۔ فطرس کیا حال ہے؟ فطرس نے گھبرا کر کہا۔ جبرئیل! کیا قیامت آگئی ہے؟ یہ زمین کی طرف کیوں جا رہے ہو؟ فرمایا کہ آخری نبیؐ کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوا ہے ہم اسکی مبارکباد کیلئے جا رہے ہیں۔ فطرس نے

مجا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں بھی لے چلیں، شاید اس مولود کے طفیل میرا یہ عتاب برطرف ہو جائے منشائے الٰہی تھا کہ فطرس کا عتاب حسینؑ ہی کے طفیل برطرف ہو۔ جبرئیل نے پروں پر اٹھایا، رسول اعظمؐ کی خدمت میں لائے۔ واقعہ بیان کیا، پیغمبرؐ نے فرمایا حسینؑ کے گہوارہ کے قریب لے جاؤ، اس کے بال و پر کو حسینؑ کے گہوارے سے مس کر دو، نئی زندگی عطا ہو گی۔ جبرئیل گہوارے کے قریب لائے، بازوؤں کو مس کیا، نئے بال و پر ملے۔ اور فطرس یہ کہتا ہوا چلا۔ "مَنْ مِثْلِي أَنَا عَتِيقُ الْحُسَيْنِ"۔ کون میرے مثل ہے، میں حسینؑ کا آزاد کیا ہوا ہوں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ فطرس رسول اکرمؐ کی خدمت میں آیا تھا اور آپ نے حسینؑ کے گہوارے کی طرف بھیج دیا۔ کیوں ہرگز۔ کیا آپ دعا نہیں کر سکتے۔ کیا آپ بال و پر عطا نہیں کر سکتے؟ آپ فرمائیں گے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن آج حسینؑ کا کمال ظاہر کرنا ہے اور امت کو بتا دینا ہے کہ بخشش درکار ہے تو حسینؑ کے دروازے پر آؤ حسینؑ کے بغیر میں نہیں بخشوا تا تو کوئی اور کیا بخشوائے گا۔

آیئے جبرئیل امین سے کہیں یہ آپ یہاں کہاں لے آئے؟ عتاب خدا کا ہے اسی سے کہئے کہ وہ برطرف کر دے۔ حسینؑ سے کیا مطلب ہے؟ خدا کے معاملات میں حسینؑ کیا کر سکتے ہیں۔ جبرئیل آواز دیں گے، نادانو میں اسی لئے لایا ہوں کہ دنیا پہچان لے کہ قدرت کے یہاں بھی کوئی کام بغیر وسیلے کے نہیں ہوتا۔ اب جو لوگ وسیلۂ آل محمدؐ کے قائل نہیں ہیں وہ اپنے بارے میں سوچیں کہ ان کا کیا انجام ہوگا۔

پیغمبر اعظمؐ نے فطرس کے بازوؤں کو حسینؑ کے گہوارے سے مس کرایا جسم سے نہیں۔ تاکہ غلاموں کو ایک مستقل سہارا مل جائے کہ ۶۱ھ کے بعد حسینؑ کا جسم تو نہ ملے گا لیکن وہ جگہ ضرور ملے گی جہاں حسینؑ آرام فرما رہے ہیں۔ اب اگر امت کو خواہش ہو تو

فطرس سے سبق لینا، اس نے گہوارے سے بازوؤں کو مس کیا تو نئے بال و پر ملے، تم ضریح حسینؑ سے اپنے جسم کو مس کرنا تمہیں زندگی ملے گی اور تمہاری زندگی کیا ہے، حسینؑ نے اسلام کو زندگی دی ہے، مذہب کو زندہ کیا ہے، قرآن کو زندہ کیا ہے، اور مختصر یہ ہے کہ اسلام زندہ ہو گیا بس کربلا کے بعد ـــــ خاتمہ کلام میں ایک فقرہ فطرس کا بھی کہہ چلوں، فطرس بڑی نادانی کی بات کر رہا ہے، ابھی کل تصور بلندی پر عتاب نازل ہو چکا ہے اور آج یہ دعویٰ ہے کہ کون میرا مثل ہے، ایک دفعہ ٹھوکر کھانے والا دوبارہ سنبھل جاتا ہے، تجھے کیا ہو گیا ہے کہ اتنے دن معتوب رہنے کے بعد پھر تجھے ہوش نہیں آیا اور ایسے نازیبا دعوے کر رہا ہے، اب اگر کہیں عتاب نازل ہو گیا تو دوسرا کوئی بخشوانے والا بھی نہ ملے گا، فطرس کہے گا نادانو! تم نے نہیں پہچانا، میں اپنے انجام کو خوب پہچانتا ہوں، میں عتاب کی مصیبت جھیل چکا ہوں، مجھے حالات کا صحیح اندازہ ہے، مجھے معلوم ہے کہ کل عتاب نازل ہو گیا تھا لیکن آج عتاب نازل نہیں ہوگا، تم پوچھو گے کیوں؟ تو سنو کل میرا دعویٰ بغیر دلیل کے تھا اسلئے عتاب نازل ہو گیا تھا آج دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی ہے اسلئے عتاب کا کوئی خطرہ نہیں، یہ یاد رکھئے فقط بے مثل ہونے کا اعلان نہیں کیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ میں حسینؑ کا آزاد کردہ ہوں، جب حسینؑ کا سہارا مل گیا تو عتاب کا کیا سوال ہے؟

ارباب نظر! مجھے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس کا وسیلہ ملک کو بے مثل بنا دے وہ خود کیسا لاجواب ہوگا۔

اور فطرس کے مقصد نے غلط سوال کا مقصد کھول دیا، اب کہنا پڑے گا کہ جون بھی بے مثل، زہیر بھی بے مثل، حر بھی بے مثل اور جب یہ سب بے مثل تو حبیبؑ بھی بے مثل، سعید بھی بے مثل، مسلم بھی بے مثل اور جب غلام بے مثل تو بھائی کیسا بے مثل ہوگا، بیٹا کیسا بے مثل ہوگا، دل کے ٹکڑے کیسے بے مثل ہوں گے اور خود کیسا لاجواب ہوگا۔

پانچویں مجلس داستانِ عزیمت کردارِ سید الشہداءؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاھرین و لعنۃ اللہ علیٰ اعدائھم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشادِ جناب احدیت ہوتا ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

مالکِ کائنات نے اس ذمہ داریِ ہدایت کو ادا کرنے کے لئے ہر دور میں انبیاءؑ بھیجے۔ مرسلین بھیجے، کتابیں نازل کیں، شریعتیں معین کیں اور سب کا مقصد ایک رہا کہ عالمِ انسانیت راہِ راست پر آجائے اور ہدایت و رہنمائی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔ انبیاءؑ زحمتیں برداشت کریں یہ گوارہ ہے۔ مرسلین پتھر کھائیں یہ گوارہ ہے۔ اولیاءِ خدا کانٹوں پر چلیں یہ گوارہ ہے۔ صادق و صدیق بندے جھٹلائے جائیں یہ گوارہ ہے، آدمؑ جنت چھوڑ کر دنیا میں آجائیں یہ گوارہ ہے۔ نوحؑ طوفانوں میں۔ رہیں، ابراہیمؑ آتشِ نمرود میں جائیں یہ گوارہ ہے۔ موسیٰؑ نیل کی موجوں میں رہیں یہ گوارہ ہے۔ عیسیٰؑ تہمتِ عصمتِ مادری کو دوچار ہوں یہ گوارہ ہے۔ مرسلِ اعظمؐ تک کی گلیوں میں لہولہان ہو جائیں یہ گوارہ ہے لیکن انسانیت بے راہنما رہ جائے یہ گوارہ نہیں ہے، عالمِ بشریت بے ہادی رہ جائے یہ برداشت نہیں ہے، بندوں کی حجت خدا پر تمام ہو جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ ادھر سے قرآن آئے گا تو ھدی للمتقین بن کر، رسولؐ آئیں گے تو "یھدون بامرنا" کا مصداق بن کر دلی و امام

آئیں گے تو "لکل قوم ھاد" کا نمونہ بن کر، یہ پورا نظام ہدایت ہے اور یہ پورا سلسلہ رہنمائی ہے۔ یاد رہے بات ہے کہ گمراہی ابتدائی منزلوں میں رہتی ہے تو رہنما ابتدائی کمالات کا حامل ہوتا ہے اور گمراہی آخری منزلوں میں پہنچ جاتی ہے تو رہنما بھی صاحب معراج ہوتا ہے۔

آدمؑ کے دور میں گمراہوں کی تعداد قلیل تھی تو انھیں اسماء کا علم دیکر بھیجا گیا تھا، نوحؑ کے دور میں یہ تعداد بڑھی تو انھیں طوفانوں سے ٹکرانے کی طاقت دیدی گئی، ابراہیمؑ کے دور میں حالات اور شدید ہوئے تو انھیں آگ کو گلزار بنانے کی صلاحیت دیدی، موسیٰؑ کو موجوں سے کھیلنے کا حوصلہ دیا تو عیسیٰؑ کو مصائب جھیلنے کا دم دیا، سرورِ کائنات کا دور آتے آتے گمراہی منزلِ کمال کو پہنچ گئی، اب ابراہیمؑ کے دور کے پتھر بھی خدا ہیں، موسیٰؑ کے دور کے جانور بھی خدا ہیں، عیسیٰؑ کے دور کے انسان بھی خدائی کے دعویدار ہیں اور کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جسے خدائی منصب نہ ہو، اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو جہالت کے سمندر میں غرق نہ ہو، افراد جاہل نہیں ہیں زمانہ جاہلیت کا ہے، سماج جاہل نہیں ہے، عالم غرقِ جہالت ہے، ایسے دور میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسا رہنما آئے جو ہر ضلالت سے ٹکر لے سکے اور ہر طوفان کو فنا کر سکے اس میں نوحؑ کا حوصلہ بھی ہو، ابراہیمؑ کا استقلال بھی ہو، موسیٰؑ کی ہمت بھی ہو، عیسیٰؑ کا کردار بھی ہو اور یہ سب ان سب سے بالاتر ہو کر اپنے دور کا باقاعدہ مقابلہ کر سکے اور قیامت یہ ہے کہ اس کا دور بھی قیامت تک کا دور ہے، اس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے ضرورت ہے کہ اسمیں وہ تمام صلاحیتیں اور وہ تمام حوصلے موجود ہوں جو قیامت تک کے لئے کافی ہوں اور اس کے پاس وہ تمام کمالات ہوں جن کا جواب صبح قیامت تک ممکن نہ ہو سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ خالق کائنات نے

لسے ہر اس کمال سے نوازا جس کا قیامت تک کوئی امکان نہ تھا اور ہر وہ اعجاز عطا کیا جس کی راہ پر دنیا کے چلنے کے امکانات تھے، قرآن جیسی کتاب دیدی تاکہ قیامت تک علم کیلئے چیلنج رہے، چاند کے ٹکڑے کرا دیئے تاکہ آسمان نوردی کیلئے چیلنج رہے، صاحبِ معراج بنا دیا تاکہ سرعتِ رفتار پر ناز ان انسان بھی سر تسلیم جھکاتا رہے۔ جاہلیت زدہ نافہم دَور میں عرشِ اعظم تک بلا کے معراج دینے کا منشا یہی تھا کہ آئندہ دنیا بھی اندازہ کرے کہ شمس و قمر و مریخ کی سیر کا حوصلہ پیدا کرنا اور ہے اور ایک رات میں سارے عالم کو زیر قدم رکھ لینا اور ہے.

سرورِ کائناتؐ تک یہ سلسلۂ ہدایت اسی انداز سے پہنچا اور پروردگار نے حالات کے مطابق ہادی اور رہنما بھیجے اور انھیں کے تقاضوں کے مطابق انکی صلاحیتیں مقرر کیں، خود اعلان فرمایا "ہم نے رسولوں میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور سب کو یکساں نہیں بنایا"۔ اور اس منزل پر کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جب اللہ والے ایک جیسے نہ ہو سکے تو امت والے کیسے برابر ہو جائیں گے اور جب انبیاء ایک مرتبہ کے نہ ہو سکے تو ان کے اصحاب میں سب ہم مرتبہ کیسے ہو جائیں گے؟ انبیاء کو ہم مرتبہ سمجھنا مرسلِ اعظمؐ کی توہین ہے اور امت کو ہم رتبہ سمجھنا آلِ محمدؐ کی توہین ہے!

مالکِ کائنات نے جاہلیت کے آثار کو دیکھ کر مرسلِ اعظمؐ جیسا کامل و اکمل پیغمبر بھیجدیا لیکن کیا ۲۳ سال میں سارا زمانہ راہِ راست پر آگیا، کیا جاہلیت فنا ہو گئی، کیا کفر و شرک کا جذبۂ انتقام ختم ہو گیا، کیا نفاق کی چنگاریاں بجھ گئیں۔؟؟ ہرگز نہیں! تو اگر ایسا نہیں ہے اور جاہلیت اور جہالت کے اثرات باقی ہیں تو کیا خدا نے اپنے نظامِ ہدایت کو معطل کر دیا ہے اور اسے مرسلِ اعظمؐ

کے بعد کی امت سے کوئی ہمدردی و محبت نہیں ہے، وہ سب کو تباہ و برباد ہی دیکھنا چاہتا ہے اور اس کا منشاء یہی ہے کہ تم پیغمبر کے بعد کیوں پیدا ہوئے، اب یونہی تباہ و برباد ہو جاؤ تاکہ میں تمھیں داخل جہنم کر دوں اور اگر یہ ظلم موجود نہیں ہے تو قدرت نے نظام ہدایت کے بارے میں کیا کیا؟ کیا بدترین حالات میں قوم کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا اور یہ طے کر دیا کہ جذبۂ انتقام سے خالی سماج کو خاتم النبیینؐ جیسے راہنما کی ضرورت ہے اور جذبۂ بغض و حسد و انتقام سے لبریز ماحول کے لئے جاہل، گنہگار، خطا کار راہنما کافی ہیں؟ (العیاذ باللہ) ایسا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تو ماننا پڑیگا کہ جیسا دور دیکھا اس نے ویسے ہی راہنما معین کئے، اور جیسا زمانہ آیا ویسے ہی ہادی مقرر کئے، اگر جاہلیت کے ماحول میں سب سے بہتر پیغمبر کو قانون کا ذمہ دار بنا کر بھیجا تو جذبۂ انتقام سے لبریز ماحول کے لئے محافظ قانون بھی ایسے ہی افراد کو بنایا جن میں سارے انبیاء کی صلاحیتیں، سارے مرسلین کے کمالات، ساری کتابوں کا علم اور سارے قوانین کی جامعیت پائی جاتی تھی، ان کا پہلا ہی وہ تھا جس کے لئے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ اگر آدمؑ کا علم دیکھنا ہے نوحؑ کا تقویٰ دیکھنا ہے، ابراہیمؑ کی خُلّت دیکھنا ہے، موسیٰؑ کی ہیبت دیکھنا ہے، عیسیٰؑ کا زہد دیکھنا ہے، ایوبؑ کا صبر دیکھنا ہے، یوسفؑ کا حُسن و جمال دیکھنا ہے تو علیؑ کے چہرے پر نظر کر دو یہاں سارے انبیاء کے کمالات نظر آجائیں گے، سارے مرسلین کا جلال و جمال نظر آجائیگا، اور انبیاء و مرسلین کا کیا ذکر ہے، اس کے چہرے میں الٰہی جلال و جمال کا پرتو نظر آئیگا، زبان اس کی ہوگی لیکن لسان اللہ ہوگی، پہلو اس کا ہوگا لیکن جنب اللہ ہوگا، ہاتھ اس کا ہوگا لیکن یداللہ ہوگا، چہرہ

اس کا ہوگا لیکن وجہ اللہ ہوگا اور نفس اس کا ہوگا لیکن نفس اللہ ہوگا۔

اس کے بعد جب حالات منقلب ہوں گے اور افق شریعت پر گمراہی کے بادل چھا جائیں گے، جاہلیت دوبارہ سر اٹھائے گی، اسلام کے نام پر کفر کی تبلیغ ہوگی حلال محمدؐ کو حرام اور حرام محمدؐ کو حلال بنایا جائیگا تو ایسے راہنما کو متعین کیا جائیگا جس میں سارے انبیاء کے کمالات بدرجہ اتم موجود ہوں گے اور ہر شخص اس کے بارے میں اقرار کریگا، آدمؑ کے وارث تجھ پر سلام، نوحؑ کے وارث تجھ پر سلام، موسیٰؑ کے وارث تجھ پر سلام، عیسیٰؑ کے وارث تجھ پر سلام، محمد مصطفیٰؐ کے وارث تجھ پر سلام، ایثار خدیجہؑ کے وارث تجھ پر سلام، صبر زہراؑ کے وارث تجھ پر سلام۔

اور عزیزان گرامی! امت ہی کا کیا ذکر ہے، خود پیغمبر بھی ڈیوڑھی پر آئیں گے تو سلام ہی کریں گے۔ گھر میں رہے گا تو سلام کریں گے، باہر نکلے گا تو دوش پر بٹھا کر ناقہ بنیں گے، مسجد میں آجائیگا تو سجدہ سے سر نہ اٹھائیں گے، منزل جہاد میں رہیگا تو صبر و ثبات کو دیکھ کر تحسین و آفرین کے کلمات کہیں گے زندہ رہیگا تو اس پر نثار رہیں گے اور شہید ہو جائیگا تو سر کے بال بکھرا دیں گے، آغاز حیات دیکھیں گے تو "حسین منی" کہیں گے اور انجام عمل پر نگاہ ڈالیں گے تو "انا من الحسین" کہیں گے۔

آج مختصر لفظوں میں اسی حسینؑ کا تذکرہ کرنا ہے جو انبیاءؑ کا وارث قرآن کا محافظ، حرمت کعبہ کا پاسبان، اسلام کا ذمہ دار، پیغمبر اکرمؐ کا لال، بتولؑ کا نور نظر، فاطمہؑ کا لخت جگر، دوش رسولؐ کا سوار، ارمان انبیاءؑ کا آئینہ دار، تبلیغ اسلام کا جوہر، کمالات کبریا کا مظہر، جمال رسول کا جواب، جلال علیؑ کا شباب عرصۂ کربلا کا خطیب، فتح مرتضیٰ کا نقیب، قلب رسالت کا چین اور سلسلۂ امامت

سکا حسینؑ ہے۔

حسینؑ کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ یہ ہے کہ ۳ شعبان سنہ ۴ھ کی صبح کو فاطمہ زہراؑ کی آغوش میں آئے، نانا کی زبان چوسی، باپ کی گود میں رہے، بھائی کے ساتھ کھیلے، سنہ ۵ھ میں خندق کا معرکہ دیکھا، سنہ ۷ھ میں خیبر کی فتح دیکھی، سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کا منظر دیکھا، سنہ ۹ھ میں مباہلہ کے میدان میں گواہِ رسالت بن کر آئے، سنہ ۱۰ھ میں زیرِ کساء آ کر مرکزِ تطہیر بنے، سنہ ۱۱ھ میں ۲۸ صفر کو نانا کا غم دیکھا اور ۱۳ جمادی الاولیٰ کو ماں کا صدمہ اٹھایا؛ ۲۵ سال تک باپ کے ساتھ خانہ نشین رہ کر خلافتوں کے حالات کا جائزہ لیا۔ گھر میں جمع قرآن کا منظر دیکھا، باہر چاہنے والوں پر مصائب کی یورش کا مشاہدہ کیا۔ اور سب کے ساتھ باپ کا صبر و استقلال بھی دیکھتے رہے۔ سقیفہ کی بیعت دیکھی، فدک میں گواہ بن کر گئے تو ارث کی تکذیب کی کیفیت دیکھی، گھر پر آگ اور لکڑیاں دیکھیں، اسلامی فتوحات کے نام پر عہد و وفا کی پامالی دیکھی، بنو امیہ کی پرورش کا منظر دیکھا، بنی ہاشم اور ان کے پرستاروں کا قتلِ عام دیکھا، آخری دور میں حاکمِ وقت کا محاصرہ دیکھا اور باپ کے رحم و کرم کا مشاہدہ کیا۔ خلیفہ سوم کے بعد باپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنے والوں کا ہجوم دیکھا، اور جمل، صفین و نہروان کے معرکے دیکھے اور فقط دیکھے نہیں بلکہ ان میں شریک بھی رہے، سنہ ۴۰ھ میں باپ کی شہادت دیکھی، سنہ ۴۱ھ میں بھائی کی صلح دیکھی، صلح کے بعد اس کا انجام دیکھا، دس سال تک بھائی کی طرف سے صلح کی پابندی دیکھی سنہ ۵۰ھ میں بھائی کی شہادت اور جنازہ کی بے حرمتی دیکھی، سنہ ۶۰ھ تک دس سال بھائی کی صلح کو نباہتے رہے اور ۱۵ رجب سنہ ۶۰ھ کو شام کے حاکم کی وفات ہوئی اور حالات نے ایکبارگی پلٹا کھایا تو جو کام سنہ ۱۱ھ میں ہوا تھا یعنی پیغمبرؐ کے بعد.

امیرالمومنینؑ سے مطالبہ بیعت کیا گیا تھا وہی کام پھر ۶۰ھ میں ہوا، اور امام حسینؑ نے طے کرلیا کہ جب میں نے آج تک بزرگوں کی روش سے علیحدگی نہیں اختیار کی تو آج علیحدگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ مجھے ثابت کردینا ہے کہ میں بھائی کے صلح کے احترام میں خاموش تھا ورنہ مجھ میں نانا کا عزم، دادا کا حوصلہ، ہاشم کا خون، عبدالمطلب کا جوش سب سلامت ہے ؎

صبر زہراؑ کا تقاضہ تھا جو اب تک تھا خموش
ورنہ بیمار دیں دل حیدر کرار بھی ہے (پیامؔ)

ان واقعات کی تفصیل پر اس لئے روشنی ڈالی گئی ہے کہ آپ ایک نظر واقعات پر ڈال لیں اور یہ دیکھ لیں کہ حسینؑ بن علیؑ کی زندگی کس سرد وگرم سے گزری ہے نانا کے ساتھ رہے تو خیبر وخندق کی جنگ بھی دیکھی اور حدیبیہ کی صلح بھی، حنین کے حملے بھی دیکھے اور فتح مکہ کی عمومی معافی بھی، نانا کے بعد دروازہ پر آگ اور لکڑیاں بھی دیکھی ہیں اور سردربار ماں کا عظیم الشان خطبہ بھی۔ ان کے بعد حکومتوں کا جبر وتشدد بھی دیکھا ہے اور باپ کی مشکل کشائی بھی، خلیفہ ثالث کی خاندان پرستی بھی دیکھی ہے اور باپ کا رحم وکرم بھی، خلیفہ ثالث کے بعد جمل کی جنگ بھی دیکھی ہے اور باپ کا دشمن کو باحترام واپس کردینا بھی، صفین کا معرکہ بھی دیکھا ہے اور قرآن کے نام پر جیتی ہوئی جنگ کا چھوڑ دینا بھی، نہروان میں خوارج کی بغاوت بھی دیکھی ہے اور مسجد کوفہ میں باپ کا قاتل کو بیدار کرکے سجدۂ آخر کرنا بھی، ابن ملجم کی گرفتاری بھی دیکھی ہے اور باپ کا شکمیں کھلوا دینا بھی، باپ کے بعد بھائی کا عزم جہاد بھی دیکھا ہے اور مصلحت اسلام کی خاطر باپ کے قاتل سے صلح کرلینا، شام کی طرف سے صلحنامہ کی پامالی بھی دیکھی ہے اور بھائی کی طرف سے پابندی بھی۔

باپ پر سب وشتم بھی دیکھا ہے اور بھائی کا صبر وثبات بھی، ۵۰ھ میں بھائی کی شہادت بھی دیکھی ہے اور جنازہ پر تیر بھی، بھائی کے بعد مسلسل دس سال تک شام کے حملے بھی دیکھے ہیں اور اپنا صبر واستقلال بھی، یہاں تک کہ ۶۰ھ کی ۲۸ رجب کو اٹھے اور ۶۱ھ کی دس محرم کو بہتّر ساتھیوں کے ساتھ راہ خدا میں قربان ہو گئے۔ امام حسینؑ نے چار دور تک سرد وگرم زمانہ کا جائزہ لیا، نانا کے ساتھ رہے، ماں کے حالات دیکھے، باپ کا زمانہ دیکھا، بھائی کا دَور دیکھا، اور ہر دور میں مختلف حالات دیکھے، اب اگر حسینؑ کا اپنا کوئی مزاج ہوتا تو کسی منزل پر تو بزرگوں سے اختلاف کرتے، جنگ کا مزاج ہوتا تو نانا کی صلح کو روکتے، ماں کے صبر کو روکتے، باپ کے سکوت کو روکتے، بھائی کی صلح کو روکتے اور صلح کا مزاج ہوتا تو خندق وخیبر وحنین کے مواقع پر مچل جاتے، ماں کے مطالبۂ فدک کو روکتے، باپ کے جمل وصفین ونہروان کے معرکوں پر پابندی عائد کرتے، بھائی کی جنگ کی تیاریوں پر ہاتھ پکڑ لیتے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، اور جس کے ساتھ رہے اس کے عمل کے پابند رہے اور بھائی کے تو مرنے کے بعد بھی دس سال تک ان کی صلح پر قائم رہے اور جنگ کا نام نہیں لیا، جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حسنؑ وحسینؑ کے مزاج میں فرق تھا، حسنؑ مزاجاً عقیاً صلح پسند تھے اور حسینؑ کے مزاج میں حرارت تھی، اسی لئے امام حسنؑ نے صلح کر لی، اور امام حسینؑ کربلا کے میدان میں آ گئے۔ ان فریب ذہنوں سے کہہ دو کہ کب تک حقائق کا انکار کرتے رہیں گے اور کب تک واقعات پر پردہ ڈالتے رہیں گے یاد رکھیں کہ جس کے مزاج میں حرارت ہوتی ہے وہ اتنی خاموشی سے زندگی نہیں گزارتا ہے اور جس کی طبیعت میں جنگ پسندی ہوتی ہے وہ باپ پر سب وشتم سن کر بھائی کی صلح کی پابندی نہیں کرتا۔ حسینؑ کا مزاج نہ جنگ کا مزاج تھا نہ صلح کا، حسینؑ کا مزاج مشیت کا

مزاج تھا جب جو مشیت پروردگار ہوئی حسینؑ نے وہی اقدام کیا۔ بزرگوں کے دور میں وہ ترجمان مشیت تھے، حسینؑ ان کے اقدام میں برابر شریک رہے۔ بزرگوں کے بعد حسینؑ وارث مزاج مشیت بنے تو ان کے مطابق پر قدم اٹھایا۔ حسینؑ کا مزاج سمجھنا ہے تو بچپنے میں دوش رسولؐ اور پشت رسولؐ پر دیکھو، رسولؐ مشیت الٰہی کا پابند ہے، حسینؑ کا مزاج ذرہ برابر مشیت سے الگ ہوتا تو نہ رسولؐ دوش پر بٹھا کر زلفیں حوالے کرتے نہ پشت پر بٹھا کر سجدہ کو طول دیتے۔ یہ سجدہ کو طول اس لئے دیا جا رہا ہے کہ دنیا پہچان لے کہ جو حسین کا مزاج ہے وہ شریعت کا مزاج ہے اور یہ زلفیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ نافہم دیکھ لیں کہ جو حسینؑ کا ارادہ ہے وہی مشیت کا حوصلہ ہے۔

سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب حسینؑ کے مزاج میں اور بزرگوں کے مزاج میں فرق نہیں تھا تو حسینؑ خاموش کیوں نہیں رہے اور جنگ کے لئے کیوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اتنی بڑی قربانی کیوں دیدی؟ لیکن مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ یہ بھی بزرگوں ہی کے مزاج کا اثر تھا، وہ بدر و احد، خندق و خیبر و حنین میں اٹھے، وہ جمل و صفین و نہروان میں اٹھے، وہ جنگ کے مختلف محاذوں پر اٹھے، اور یہ کربلا کے محاذ پر اٹھے۔ مزاج کا اختلاف ہوتا تو ایسا اتحاد کیوں ہوتا؟ اب اگر ان سب کا اقدام صحیح ہے تو حسینؑ کا اقدام بھی صحیح ہے۔ اگر حسینؑ کا اقدام غلط ہے تو ان سب کا اقدام بھی غلط ہے (معاذ اللہ)

آپ کہیں گے کہ ان سب کی جنگ میں اور حسینؑ کی جنگ میں ایک فرق تھا، مرسل اعظمؐ کی جنگیں مکہ سے دور مدینہ سے قریب حضور کے علاقہ میں ہوئی ہیں، اور مولائے کائنات کے مجاہدات شام سے دور کوفہ سے قریب علیؑ کے علاقہ میں ہوئے ہیں لیکن کربلا تو حسینؑ کا علاقہ نہیں تھا۔ بزرگوں کی جنگ کو دفاعی کہا

جا سکتا ہے لیکن حسینؑ کی جنگ کو دفاع نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ارباب کرم! اوّلاً تو رسول اکرمؐ اور مولائے کائنات میدانوں میں خود گئے تھے لیجائے نہیں گئے تھے لہٰذا ان پر یہ الزام زیادہ عائد ہو سکتا ہے، امام حسینؑ تو حرکے رسالہ کے ذریعہ لیجائے گئے تھے، ان پر یہ الزام کیوں کر عائد ہو سکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہؑ امام حسینؑ کی دور اندیشی اور نگاہِ امامت کی وسعت تھی کہ آپنے سرزمین کربلا پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ اہلِ قریہ کو بلا کر ان سے زمین کو خریدا اور زمین کو خرید کر قیامت تک کے لئے مسئلہ کو صاف کر دیا کہ خبردار اب یہ نہ کہنا کہ میں اپنے نانا کی سیرت سے الگ ہو گیا ہوں، میں نے نانا ہی کی سیرت کا ایک حسین نمونہ پیش کیا ہے، وہ فقط علاقوں پر حملہ کرنے والوں کو لڑے تھے اور میں نے تو ان سے جہاد کیا ہے جو میری زمین پر آ گئے تھے، یاد رکھو کربلا کا جہاد کسی غیر کی زمین پر نہیں ہے، یہ جہاد حسین کی زمین پر ہے اسلئے دنیا کی ہر طاقت پر جارحیت کا الزام لگایا جا سکتا ہے لیکن حسینؑ پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

دوسرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ امام حسین کے حالات بزرگوں کے حالات سے قدرے مختلف تھے اور امام حسنؑ کے حالات سے تو قطعاً مختلف تھے، امام حسنؑ کے حالات میں صلح کرنا ہی عین اسلام تھا اس لئے امام حسینؑ صلح میں شریک رہے اور امام حسینؑ کے دور میں جنگ کرنا ہی واجب تھا، اسلئے امام حسنؑ نے قاسم کو وصیت کر دی تھی کہ بیٹا جب بھی تیرے چچا پر کوئی وقت پڑ جائے تو اپنے چچا پر قربان ہو جانا، تاکہ میری صلح میں حسینؑ کی شرکت رہے اور ان کی جنگ میں میری شرکت ہو جائے۔

حالات کے فرق کو سمجھنا ہے تو تاریخ اسلام کے ایک واقعہ پر نگاہ کرنا ہوگی، جس کے بغیر بدلے ہوئے حالات میں اقدام کی نوعیت کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ دنیائے اسلام میں مباہلہ کا واقعہ کسے نہیں معلوم، کون نہیں جانتا کہ ۹ھ میں حضور سرورِ کائناتؐ سے اور عیسائیوں سے بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ اور یہ مقابلہ تیر و خنجر کا نہ تھا بلکہ حق و صداقت، علم و آگہی اور بندگی اور فرزندی کا مقابلہ تھا۔ تیر و خنجر کے مقابلہ میں بظاہر ہار جانا بھی عیب نہیں ہوتا اس پر کسی نہ کسی جہت سے مظلومیت کی چھاپ لگادی جاتی ہے۔ لیکن علم و دانش اور حق و صداقت کی جنگ میں ہار جانا قانون کی فنا اور مذہب کی بربادی کے مترادف ہے۔ دنیا میں بے شمار افراد ہیں جو حملہ کرنے کے بعد بھی جب ہار جاتے ہیں تو اپنی ہار کو تسلیم کر کے جارحیت پر مظلومیت کا لیبل لگا دیتے ہیں، لیکن مقام بحث میں یہ پسند نہیں کرتے کہ انھیں ظالم و جارح اور باطل پرست کہدیا جائے گا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تیر و خنجر کا معرکہ آسان ہوتا ہے اور علم و آگہی کا معرکہ سخت۔ تلوار کا زخم جلدی مندمل ہو جاتا ہے اور زبان کا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا، خصوصیت کے ساتھ اسلام کے ساتھ تو یہ معرکہ اور بھی سخت ہے، وہ تیر و خنجر کا مذہب نہیں ہے علم و دانش کا مذہب ہے، اس کی نظر میں تخت و تاج، حکومت و ملک گیری اقتدار و اختیار کوئی شے نہیں ہے، وہ دنیا کو عقائد کی تعلیم اور صحیح نظریات کی تلقین کرنے کے لئے آیا ہے، وہ اس دن اپنی فتح نہیں سمجھتا جب دشمن تہ تیغ ہو جائے بلکہ وہ اس دن کو فتح مبین سمجھتا ہے جب اصول کی فتح ہو اور ظلم و تشدد والوں کو عظمتِ کردار کا اقرار کرنا پڑے۔ ایسے حالات میں مباہلہ کا مقابلہ اسلام کی موت و حیات کا مقابلہ تھا، اسلام شکست کھا جائے تو اسے روئے زمین پر رہنے کا حق نہیں ہو۔

اور عیسائیت ہار جائے تو اسے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ مسئلہ بے حد نازک ہے۔ عیسائیت کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور اسلام کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بندے ہیں، عیسائیت کی نگاہ میں توحید بے قیمت ہے اور اسلام کی نگاہ میں توحید ہی اصل مذہب اور جانِ عقیدہ ہے۔ ایسے سخت موقع پر عیسائیوں نے اپنے علم و فضل کے غرور میں اسلام کے دیار پر سرد حملہ کر دیا، اور پیغمبر اسلام کی خدمت میں یہ ثابت کرنے کے لئے آگئے کہ عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں بندے نہیں، سوال یہ ہے کہ اگر اللہ کے بیٹے بھی ہیں تو آپ مانیے، کون آپ کو منع کرتا ہے آپ تو صدیوں سے مانتے چلے آرہے ہیں۔ خود مرسلِ اعظمؐ کی زندگی میں تقریباً آٹھ برس سے آپ مان رہے ہیں، کہاں پیغمبرؐ نے آپ پر حملہ کر دیا، کون سی جنگ آپ سے کی، کس کو تلوار ماردی، کس کو نیزہ چبھو دیا، یہ آج کیا ہو گیا ہے کہ آپ اپنے وطن سے مدینہ چلے آئے ہیں اور یہ ضد ہے کہ پیغمبرؐ بھی عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مان لیں، یہ چھیڑ چھیڑ کر لڑنے کی کیا ضرورت ہے، اگر پیغمبرؐ نہ بھی مانیں گے تو آپ کے عقیدہ پر کیا اثر پڑے گا۔ اور آپ کا مذہب کہاں باطل و برباد ہو جائے گا لیکن نہ جانے کیا راز تھا کہ عیسائیت کو اس کے وطن میں قرار نہیں آیا اور بالآخر دیارِ اسلام میں آگئے۔ قدرت نے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر آیتوں پر آیتیں نازل کیں، عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ جیسی جب آدمؑ بغیر ماں باپ کے پیدا ہو کر اللہ کے بیٹے نہ ہو سکے تو عیسیٰؑ صرف باپ کے بغیر پیدا ہو کر کیوں کر ابن اللہ ہو سکتے ہیں۔ آیتیں نازل ہوئیں لیکن عیسائی اپنی ضد پر اڑے رہے اور حوصلہ یہ رہا کہ اسلام کو شکست دے کر توحید کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ قدرت کی تیوریوں پر بل آگئے۔ میرے پیغمبرؐ! اب یہ نہیں مانتے ہیں تو ان سے مباہلے کے لئے کہہ دو، اور تم دونوں مل کر ہماری بارگاہ میں جھوٹوں پر

لعنت کرو، جو جھوٹا ہوگا ہم اسے ہلاک و برباد کر دیں گے۔ پیغمبرؐ نے مباہلہ کی پیشکش کر دی، عیسائیوں نے غرورِ حقانیت میں اسے قبول کر لیا، اور دوسرے دن مباہلہ کی بات طے ہوگئی۔

واقعہ پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں نے تاریخ میں یہ واقعہ پڑھا تو مجھے بیحد تعجب ہوا کہ آخر مباہلہ کا کیا مطلب ہے؟ یہ بددعا کی لڑائی کیسی لڑائی ہے، مٹھی بھر عیسائی اپنے وطن سے دور آئے ہوئے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کا ہجوم ہے، ایک سے ایک جری، ایک سے ایک سا ونت، ایک سے ایک سورما، ایک سے ایک غازی، حضور تلوار اٹھا دیجئے اور سب کا خاتمہ کر دیجئے حقیقت کو مانیں یا داخلِ جہنم ہو جائیں، یہ مباہلہ وغیرہ کیا چیز ہے؟

پیغمبرؐ فرمائیں گے، تو نے مصلحت کو پہچانا نہیں، اسلام تیر و شمشیر کا مذہب نہیں ہے، عیسائی طاقت کے بھروسے پر آئے ہوتے تو اب تک سب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ یہ علم و دانش کے اعتبار پر آئے ہیں لہٰذا ان سے علمی مقابلہ ہی ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ کل انھیں موقع مل جائے کہ اسلام کے پاس علم و حق نہیں تھا، اس لئے تلوار پر اتر آیا ہے مباہلہ کرو ں گا اور جارحیت کا الزام نہ لوں گا۔ وہ جاہل ہوتے ہیں جو علمی مسائل میں تلوار اٹھا لیا کرتے ہیں۔ میری سیرت یہی ہے کہ علم کا جواب علم سے دیا جائے تلوار سے نہیں۔ اب اگر کوئی علمی میدان میں تلوار اور تازیانے سے کام لے تو اسے وارثِ رسول نہیں کہا جا سکتا، اور وہ میری سیرت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

مباہلہ ہوا، تلوار نہیں اٹھی اور عیسائیوں نے شکست کا اعتراف کیا، اور مجھے کہنا پڑا کہ کس قدر بے شرم ہے وہ قوم جس کے مقابلہ میں کبھی تلوار نہیں

اٹھی اور وہ اسلام پر بزورِ شمشیر پھیلنے کا الزام لگا رہی ہے۔ کاش یہ بات کفار و مشرکین نے کہی ہوتی تو کوئی پہلو نکل بھی سکتا۔ یہ عیسائی کس منھ سے کہہ رہے ہیں جنھوں نے بغیر تلوار کے اُٹھے ہوئے اپنی شکست کا اقرار کر لیا تھا۔

مُباہلہ کی صبح آئی، مرسلِ اعظمؐ بیت الشرف سے برآمد ہوئے۔ انگلی پکڑے ہوئے امام حسنؑ، گود میں امام حسینؑ۔ رسول اکرمؐ کے پیچھے معصومۂ عالمؑ اور ان کے پیچھے مولائے کائناتؑ۔ نہ کوئی صحابی، نہ کوئی زوجہ، نہ کوئی سادات، نہ کوئی ہم آشنا، نہ کوئی مشیر کار۔ پہچان لیجیے کہ اسلام کے محافظ کون ہیں اور دینِ الٰہی کی حقانیت پر وقت پڑتا ہے تو کون کام آتا ہے؟ یہاں غلاموں کا ذکر نہیں ہے۔ وہ تو آقا کے ہوتے ہوئے ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے، اور اپنے کو مرضیِ مولا کا پابند سمجھتے ہیں، ان کا ذکر ہے جنھیں محافظِ اسلام اور پاسبانِ شریعت بننے کا شوق ہے اور جن کے ذاتِ صداقت پر کوئی ایسا دھبہ ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ مباہلہ میں لیجانے سے گریز کر رہے ہیں بلکہ مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ جس کی صداقت مباہلہ میں جانے کے لائق نہ ہو وہ اسلام میں سچا کیسے ہو جائے اور جسے مُباہلہ کا فاتح اور رسالت کا مصدق قرار دیا جائے اس کی گواہی نا قابلِ اعتبار ہو جائے، ایسے مسلمانوں سے تو عیسائی بہتر تھے کہ انھوں نے صداقتِ آلِ محمدؐ کو پہچان لیا تھا، مسلمان تو اتنا بھی نہیں پہچان سکے۔

میدان میں قدم رکھنا تھا کہ عیسائی عالم نے آواز دی۔ خبردار مباہلہ نہ کرنا، یہ وہ چہرے ہیں کہ اگر خدا سے دعا کر دیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، یہ بددعا کر دیں گے تو روئے زمین پر ایک بھی عیسائی باقی نہ رہے گا۔ مباہلہ رکا، اسلام فاتح بنا، جزیہ ملا، قرآن کی آبرو بچی، توحید کا وقار قائم ہوا، رسالت

کی صداقت ثابت ہوئی، دینِ خدا کا بھرم رہا، مسلمان سربلند ہوئے اور یہ سب صدقہ ہے آلِ محمدؐ کی صداقت وحقانیت وجلالت کا۔ قیامت ہے کہ بعض مسلمان آج بھی ان کی صداقت وحقانیت میں شبہ کرتے ہیں۔

بات آگے بڑھ گئی۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا تھا کہ جب قدرت نے سیکڑوں سال عیسائیوں کے عقیدہ کو برداشت کرلیا تھا اور عذاب نازل نہیں کیا تھا۔ مرسلِ اعظمؐ سات سو سال دیکھتے رہے، اور مقابلہ پر نہیں آئے تو آج کیا ہوگیا ہے کہ رسولؐ مباہلہ کے لئے تیار ہوگئے؟ اور قدرت عذاب نازل کرنے پر آمادہ ہے اب وہ صبر کی طاقت کہاں گئی؟ اب وہ قوتِ برداشت کیا ہوگئی؟ کیا یہ کہہ دیا جائے کہ خدا کا مزاج بھی بدلتا رہتا ہے؟ کیا یہ سوچ لیا جائے کہ نبوت کے مزاج کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے یا نہیں....! بات صرف یہ ہے کہ جب تک باطل اپنے دیار میں باطل پرست رہتا ہے، حق اسے برداشت کرتا ہے اور جب حق سے اپنے باطل کو منوانے پر آمادہ ہوجاتا ہے تو مقابلہ سخت ہوجاتا ہے۔

صلحِ حسنؑ اور جنگِ حسینؑ میں یہی فرق تھا، امام حسنؑ کے دور میں باطل اپنے باطل پر اڑا ہوا تھا لیکن حق سے بیعت کا مطالبہ نہیں کر رہا تھا اور امام حسینؑ کے دور میں مطالبۂ بیعت بھی ہوگیا تھا، اسی لئے امام حسنؑ کے دور میں باطل نے صلح کرکے حکومت مانگی تو آپ نے تخت وتاج کو ٹھوکر ماردی اور امام حسینؑ کے دور میں بیعت یا سر کا سوال ہوگیا تو آپ نے بیعت کو ٹھوکر مار کر سر دیدیا۔ جو حسنؑ نے کیا، وہ حسینؑ نے کیا۔ جو حسینؑ نے کیا وہ حسنؑ نے کیا۔

عیسائیت نے شکست مان لی، لیکن دل میں جو جذبۂ انتقام پیدا ہوا وہ ناقابل برداشت تھا۔ مختلف راستوں سے اسلام کو مٹانے کا منصوبہ بنایا

گیا، کبھی معاویہ کے دربار میں شاہی طبیب کی شکل میں پہنچی اور ایسا زہر تیار کیا جس سے مولائے کائنات تک محفوظ نہ رہ سکے اور ابن ملجم کی تلوار کے ذریعہ وہ زہر حضرت علیؑ پر آزمایا گیا اور جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ امام حسنؑ پر آزمایا گیا۔ اب مباہلہ کی آخری فرد امام حسینؑ باقی تھے اور عیسائیت انھیں بھی فنا کر دینا چاہتی تھی، چنانچہ حاکم شام کے محل میں زوجہ کی شکل میں پہنچی اور یزید جیسے منحوس فرزند کو جنم دیا، یزید دیہات میں عیسائی ماحول میں پلا اور شراب و کباب کا ایسا خوگر ہو گیا کہ ظاہری اسلام بھی نہ رہ گیا، اور اسی یزید کے ذریعہ امام حسینؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا، یزید کو باپ کی طرف سے نفاق ملا تھا اور ماں کی طرف سے عیسائیت، اور دونوں اسلام کے شدید دشمن تھے اب اسلام کے ذمہ دار تنہا امام حسین تھے، چنانچہ دونوں طاقتوں نے مل کر انتقام کا منصوبہ بنایا، اور ۲۷ رجب کو امام حسینؑ کے سامنے بیعت کا سوال پیش کر دیا گیا۔ امام حسینؑ نے سوال بیعت کو رد کر دیا! اور وطن چھوڑ کر باہر نکلنے کا عزم کر لیا۔ جب رات میں خدا کا رسول معراج میں گیا تھا اس رات میں رسولؐ کا نواسہ نانا کی قبر سے لپٹا ہوا رو رہا ہے اور فریاد کر رہا ہے کہ نانا! آپ کی امت نے بہت ستایا ہے۔ اب میرے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟

آواز آئی۔ بیٹا حسینؑ کربلا جاؤ میرے لال، بیٹا! تم سر کٹاؤ تاکہ میرا دین سر بلند ہو، اور میرے لال تنہا نہ جانا، میری بیٹیوں کو ہمراہ لے کر جانا تاکہ یہ قیدی بنیں تو میرا دین آزاد ہو۔

نانا کی قبر سے اٹھ کر حسینؑ ماں کی لحد پر آئے۔ آخری سلام کیا۔ اماں! آپ کی قبر کا مجاور حسینؑ جا رہا ہے۔ اماں اپنے لال کا آخری سلام لے لو، قبر اطہر سے آواز آئی۔ میرے لال! میرا بھی سلام لے لے، حسینؑ تم تنہا نہیں

جاؤ گے۔ یہ ماں تمھارے ساتھ چلے گی، جہاں تم رہوگے رہے گی، یہ ماں بھی رہیگی۔ قبر سے رخصت ہو کر گھر آئے، سامانِ سفر تیار کیا، صبح کو قافلہ روانہ ہوا، ہاشمی خواتین نے شہزادیوں کو رخصت کیا۔ ام البنین نے اپنے فرزندوں کو خداحافظ کہا عبداللہ بن جعفر نے عون و محمد کو ساتھ کیا۔ محمد حنفیہ بھائی سے لپٹ کر رو دئے اور ایک کمسن بچی اپنے کمسن بھتیا سے لپٹ کر رو دی۔ ام سلمہ نے حسینؑ کو خداحافظ کہا، بیبیوں نے حلقہ بنایا، سیدانیوں کی سواری درمیان سے گزری۔ الوداع الوداع الفراق الفراق، السلام السلام کی آوازیں بلند ہوئیں۔

کیا قیامت کا منظر تھا، قبر رسولؐ ہل رہی تھی، زہراؑ کی لحد کو زلزلہ تھا حسنؑ تربت میں تڑپ رہے تھے، بیبیوں میں شورِ ماتم تھا، دیکھئے اب یہ قافلہ کب آتا ہے اور ایک منادی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی، مدینہ والو جی بھر کر دیکھ لو، اب یہ قافلہ اس شان سے نہ آئیگا، اور جب آئیگا تو ماؤں کی گودیوں میں بچے نہ ہوں گے، سروں پر وارثوں کے سائے نہ ہوں گے، ام کلثومؑ کی فریاد ہوگی، نانا کے مدینہ ہمارے آنے کو قبول نہ کرنا، ہم لٹ کر آئے ہیں۔

چند دنوں کے بعد قافلہ مکہ پہنچا، اہلِ کوفہ نے طلبی کے خطوط بھیجے۔ امام حسینؑ نے اپنے بھائی مسلم کو روانہ کیا۔ ۹ ذی الحجہ کو مسلم کوفہ میں شہید ہوئے اور ادھر حاجیوں کے بھیس میں قاتلوں کا قافلہ مکہ آیا۔ امام حسینؑ نے ۸ ذی الحجہ حج کو عمرہ سے تبدیل کر کے سفر شروع کیا۔

ابن عباس نے روکا، مولا! سب آرہے ہیں اور آپ جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا! ابن عباس میں عراق جا رہا ہوں، نانا کے حکم سے سر کٹانے جا رہا ہوں عرض کی۔ فرزندِ رسولؐ! پھر عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جا رہے ہیں؟ فرمایا!

ابن عباس مصلحت پروردگار یہی ہے، اُدھر پردۂ محمل سے زینبؑ کی آواز آئی، ابن عباس خاموش۔ خبردار! کیا چاہتے ہو، زینبؑ اپنے حسینؑ کا ساتھ چھوڑ دے، یاد رکھو! زینبؑ جبتک زندہ ہے اپنے ماں جائے کا ساتھ نہ چھوڑے گی

قافلہ چلا۔ راستہ میں شہادتِ مسلمؑ کی خبر ملی، آگے بڑھے تو حُر کا لشکر ملا، راستہ روکا گیا، آپ نے حُر کے لشکر کو سیراب کیا اور دونوں قافلے ساتھ چلنے لگے، دوسری محرم کو سرزمینِ کربلا پہ وارد ہوئے، قافلہ اُترا، زینبؑ نے کہا، بھیّا! اس مٹی سے تو آپکے خون کی بو آتی ہے۔ فرمایا، بہن! بس یہی ہماری آخری منزل ہے، یہیں یہیں شہید ہونا ہے اور تمہیں یہیں قیدی بننا ہے، وقت گزرتا رہا۔ دشمنوں کے لشکر آتے رہے۔ پانچویں سے پانی بند ہوا۔ ساتویں سے قحطِ آب ہوا، نویں کو امام حسینؑ نرغۂ اعدا میں گھر گئے۔ عصر کو حملہ کی تیاریاں ہوئیں، علمدارِ حسینی نے ایک شب کی مہلت مانگی، تمام رات عبادتِ الٰہی میں بسر ہوئی۔ بیبیوں نے بچوں کو جنگ کی تلقین کی، شہزادیوں نے گود کے پالوں کو فنونِ جنگ تعلیم کئے۔ سحر کا ہنگام آیا، علی اکبرؑ نے اذانِ صبح کہی، بیبیوں نے صدائے پیمبرؐ سُنی، اصحاب نے مصلّے بچھائے، امامؑ نے نماز پڑھائی، فوجِ دشمن میں طبلِ جنگ بجا، حملہ شروع ہوا، تیروں کی بوچھار ہوئی، اصحاب نے حملوں کو روکا، چند ساعت میں تقریباً ۵۰ اصحاب کام آگئے، ظہر کا ہنگام آیا، اصحاب کی خواہش پر صفیں قائم ہوئیں، امامؑ نے نماز پڑھائی، تیر آتے رہے، سعید و زہیر روکتے رہے اور زخمی ہوتے رہے۔ نماز کے بعد ایک ایک کرکے میدان میں گئے، حبیب، مسلم، زہیر، بریر، عابس، ہلال، حُر، وہب سب کام آئے، اصحاب کے بعد دل کے ٹکڑوں کی باری آئی، اولادِ عقیلؑ، اولادِ ابوطالب، اولادِ علیؑ سب راہِ خدا میں قربان ہوگئے، اکبرؑ نے برچھی کھائی، قاسمؑ کا لاشہ پامال ہوا، عون و محمد کی لاشیں آئیں۔

عباس ترائی میں سو گئے۔ اصغرؑ کو امام حسینؑ گودی میں لے کر آئے۔ بچہ تیر حرملہ کا نشانہ بنا۔ رخصت آخر کے لئے آئے۔ بیمار بیٹے کو وصیت کی۔ میرے لال قید شام سے چھوٹ کر مدینہ جانا تو ہمارے شیعوں سے ہمارا سلام کہہ دینا اور کہنا، شیعو! ٹھنڈا پانی پینا تو ہماری پیاس کو یاد کر لینا، اور کسی غریب دیے کس کا ذکر سننا تو ایسے رونا جیسے کوئی ماں اپنے لال کو تڑپ تڑپ کر روتی ہے۔ بیبیوں کو رخصت کیا۔ بہن کو بھرا گھر سونپا، بیٹی سے دامن چھڑایا، سلام آخر کر کے باہر آئے۔ اصحابؓ کو پکار کر ضعف و ناتوانی کا اعلان کیا۔ زینبؑ نے خیمہ سے نکل کر گھوڑے پر سوار کیا، سکینہ نے دامن پکڑا۔ بابا! مدینہ پہونچا دو۔ حسینؑ نے مرثیہ پڑھا، بیٹی مدینہ جانا ممکن ہوتا تو یہ بھرا گھر کیوں اُجڑتا؟ اور تیرا باپ مرنے کے لئے کیوں جاتا۔؟ رخصت کیا، میدان میں آئے، حملہ پر حملہ کیا، ندائے قدرت آئی۔ بس اے حسین بس! میرے نفس مطمئن اب پلٹ آ، تلوار نیام میں رکھی، پشت زین پر سر جھکایا، حملے شروع ہوئے۔ تیر، تلوار، نیزہ، پتھر، زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرے۔ ذوالجناح نے جھک کر سہارا دیا۔ تیروں نے اٹھ کے استقبال کیا۔ خاکِ کربلا تک پہونچے۔ سجدہ آخر میں پیشانی رکھی، مناجات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروردگار! حسین تیری مرضی پر راضی ہے۔ تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم جھکائے ہوئے ہے، میرے معبود! میں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ اب تو نانا کی اُمت کا خیال رکھنا۔ مناجات تمام ہوئی، شمر کا خنجر چلا۔ زینبؑ نے پسر سعد کو آواز دی۔ پسر سعد! میرا بھیا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔ زمین کربلا ہلی، سیاہ آندھیاں چلیں، آفتاب کو گہن لگا، صحرا میں زہراؑ کی فریاد کی آواز گونجی۔ آسمان سے منادی نے پکار کر کہا۔

اَلَا قُتِلَ الحُسَینُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الحُسَینُ بِکَرْبَلَا۔

زینبؑ تڑپ کے عابد بیمار کے قریب آئیں، میرے لال آنکھیں کھولو، قیامت آگئی، بیٹا! زینبؑ بن بھائی کے ہوگئی۔ میرے لال تم یتیم ہوگئے۔ عابد بیمار نے آنکھیں کھولیں۔ پھوپھی اماں۔ ذرا خیمہ کا پردہ تو اُٹھائیے۔ زینبؑ نے بڑھ کر خیمہ کا پردہ اُٹھایا۔ بیمار نے سنبھل کر دیکھا۔ ایک نیزۂ طویل پر باپ کا سر۔ آواز دی۔ السلام علیک یا ابا عبداللہ، السلام علیک یا بن رسول اللہ۔ بابا یتیم بیٹے کا سلام لے لو بابا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔!

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

امام زین العابدین علی ابن الحسین علیہ السلام

اسم مبارک :- علیؑ

کنیت :- ابو محمد

والد ماجد :- امام حسین علیہ السلام

والدۂ ماجدہ :- حضرت شہر بانو (شاہ زنان)

ولادت :- ۱۵ رجمادی الاولیٰ ۳۸ھ یا ۵ رشعبان المعظم

اولاد :- گیارہ فرزند - چار دختر

شہادت :- ۲۵ رمحرم ۹۵ھ

عمر مبارک :- ۵۷ سال

قبر مطہر :- جنت البقیع - مدینہ منورہ

چھٹی محفل داستانِ عظمت امام زین العابدینؑ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ سیّد الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیّدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللّٰہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللّٰہ الحکیم فی کتابہ الکریم ــ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا وآخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ آیت کریمہ کے ذیل میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ مالک کائنات نے ہدایت بشر کا انتظام خود انسان کے حوالے نہیں کیا بلکہ اپنے لطف وکرم کی بنا پر یہ ذمہ داری اپنے اوپر رکھی ہے۔

کون تھا دنیا میں جو اس کے سر کوئی ذمہ داری ڈال سکتا ــ کس کی مجال تھی جو اس پر کوئی فریضہ عائد کر سکتا۔ وہ قادر مطلق تھا اور بندہ عاجز وناتواں۔ وہ خالق کائنات تھا اور بندہ ذرۂ ناچیز۔ وہ عالمین کا پالنے والا تھا اور بندہ ایک حقیر بے مقدار کس انسان کی مجال تھی جو اللہ پر کوئی ذمہ داری عائد کر سکتا۔ یہ اس کا کرم تھا کہ اس نے اتنا عظیم فرض خود اپنے ذمہ عائد کر لیا اور اپنے بندوں کو اس بار گراں سے سبکدوش کر دیا۔ اب بندوں کی ذمہ داری صرف اطاعت ہے ــ ان کا کام صرف فرماں برداری ہے اور بس۔

کون تصور کر سکتا ہے اس کرم بے پایاں کا ــ کہ جس مسئلہ کو حل کرتے ہوئے عالم کفر کی صدیاں گذر گئیں اور مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اس مسئلہ کو مالک کائنات نے لمحوں میں حل کر دیا اور انسان کو کسی زحمت میں مبتلا نہیں ہونے دیا ــ اور نہ فقط مسئلہ کو حل کر دیا بلکہ انسان کو یا خبر بھی کر دیا کہ وہ انتظام ہدایت کے سلسلے میں کوئی زحمت نہ کرے

اور مالک کائنات کے کرم پر اعتماد کرے اور یہ حق بھی دے دیا کہ بندہ خدا سے ہادی اور رہنما کا مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ جب تونے ہدایت کا وعدہ کیا ہے تو آج ہمارا ہادی رہنما کہاں ہے اور اس دور کے لئے ہدایت کا کیا انتظام کیا ہے؟

اسی سوال اور اسی تقاضے کا لحاظ تھا کہ اس نے ہر دور میں حجت کا اہتمام کیا اور کسی دور کو حجت خدا سے خالی نہیں رکھا۔ ایسا نہ ہو کہ ہدایت لینے والے موجود رہیں اور ہدایت دینے والا نہ رہے۔ دنیائے اسلام کو آج بھی حق ہے کہ وہ رب العالمین سے یہ مطالبہ کرے کہ تو نے اس دور کے لئے ہدایت کا کیا انتظام کیا ہے اور مالک کائنات کا فرض ہے کہ وہ ہدایت کا اہتمام کرے ورنہ اپنے نظام کو ناقص و ناتمام تسلیم کرے۔

نظام قدرت ناقص و نامکمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آج بھی کوئی ہادی و رہنما ہے۔ جو امت کی ہدایت کا اہتمام کر رہا ہے اور بندوں کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ اب یہ قدرت کے اختیار کی بات ہے کہ وہ اسے کہاں رکھے اور کس حال میں رکھے۔ اس مقام پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر نگاہوں سے غائب ہے تو ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ اس لئے کہ اس طرح تو خود خدا پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور اس کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ جب نگاہوں سے غائب ہے تو کیا انتظام کرے گا؟ قدرت نے واضح کر دیا کہ جس طرح میری غیبت پر ایمان رکھنا ضروری ہے اسی طرح میری حجت کی غیبت پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہوگا۔

قدرت نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے اور ایک نہ ایک ہادی و رہنما ضرور معین کیا ہے اور یہ انسان کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو ایک عظیم زحمت سے بچا لیا اور کائنات کے عظیم ترین مسئلہ کو لمحوں میں حل کر دیا۔ مذہب اسلام میں ائمہ معصومینؑ کی ولادت کے موقع پر

جو اعمال بیان کئے گئے ہیں اور جن میں نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ کی تاکید کی گئی ہے اس کا بھی شاید اسی طرف اشارہ ہے کہ آج کے دن مالک کائنات کے کرم کی تجدید ہوئی ہے لہٰذا بندہ کا فرض ہے کہ اس کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرے اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرتا رہے۔ خود معصومینؑ نے بھی پوری زندگی اسی شان سے عبادت اور سجدہ گذاری میں طے کی ہے کہ تاریخ کائنات میں کہیں اس کا جواب نہیں مل سکتا اور یہ اسی لئے ہے کہ جب ہادی پانے میں سجدہ شکر ضروری ہے تو جس کو ہادی یا رہنما بنایا گیا ہے وہ کس طرح سجدۂ شکر نہ ادا کریگا ــــ صلوات۔

اہلبیتؑ طاہرینؑ کو اللہ نے کچھ ایسے فضائل و کمالات عطا کئے ہیں جن کی مثال آدمؑ و عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک امت پیغمبرؐ ہی کا کیا ذکر ہے۔ عبادات و اطاعت کے ذیل میں تو میرا دل چاہتا ہے کہ ایسے بندہ پروردگار کا تذکرہ کروں جس کی عبادت شاہکار اور اس کے سجدے یادگار رہوں۔ ایسا عابد و زاہد کہ بزم عبادت بے رونق ہو جائے اگر وہ نہ رہے اور ایسا سجدہ گذار کہ کاروانِ عبدیت بے قافلہ سالار ہو جائے اگر وہ نہ رہے۔ وہ عظیم انسان جسے اللہ نے عرب و عجم کی شرافت و سیادت کا مرکز بنایا ہے جس کی ذات اقدس پہ عرب کو بھی ناز ہے اور عجم کو بھی۔ عربیت کا وہ عالم کہ جان ہاشم۔ روح عبدالمطلب۔ قلب ابوطالبؑ۔ راحت علیؑ اور نور نگاہ حسینؑ مظلوم اور عجمیت کا وہ امتیاز کہ شہزادی عجم شہربانو کا لال بادشاہ فارس یزدجرد کا نواسہ اور آخر میں اس کی نسل میں جس کے دور حکومت پہ مرسل اعظمؐ کو ناز کہ میں ایک بادشاہ عادل کے دور میں پیدا ہوا ہوں اور یہیں پہ آکر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اگر دور عادل میں پیدا ہو جانا اپنی عدالت کی نشانی اور تمہید ہے تو نسل عادل میں آنا کتنی بڑی حسین تمہید ہوگی اور پھر جب عدالت پر عصمت کا رنگ

چڑھ جائے گا تو کردار کی بلندی کا کیا عالم ہوگا اس کا اندازہ تو کوئی معصوم ہی کر سکتا ہے۔ غیر معصوم کے بس کی بات نہیں ہے

دنیائے اسلام کے فاتحین نے قوم عجم کو ذلیل کر کے عرب و عجم کی تفریق کی وہ بنیاد رکھی تھی جو آج تک ختم نہیں ہو سکی اور اسلام میں عرب و عجم کا سلسلہ باقی ہے۔ وہ پیغمبر اسلامؐ جس نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ عجم پر عرب کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کا معیار تقویٰ ہے۔ اس کی امت نے قومیت کو معیار فضیلت بنا لیا اور اس کی مسند پر بیٹھنے والوں نے تفریق کی خلیج کو اتنا وسیع کر دیا کہ آج تک پُر نہ ہو سکی۔ قربان جائیے فلسفہ آل محمدؐ کے کہ انھوں نے اپنے جد کے دین کو بچانے کے لئے کوئی قدم اٹھا نہیں رکھا اور جہاں جہاں اہل دنیا نے دین کو رسوا کرنے کی کوشش کی وہیں آل محمدؐ نے کردار کی شمعیں روشن کر دیں اور اپنے جد کے دین کو رسوائی و ذلت سے بچا لیا۔

تاریخ اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتی کہ جب امیر المومنینؑ کے دور حکومت میں آپ کے عامل "حریث" نے عجم کی دو خواتین کو قیدی بنا کر بھیجا تو سارا سماج قیدیوں کو ذلت و رسوائی کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور اسلام کا مسخ شدہ تصور ذہن میں رکھنے والے یہی امید کر رہے تھے کہ اب علیؑ ان خواتین کے ساتھ کنیزوں جیسا برتاؤ کریں گے اور انھیں عجمیت کی قرار واقعی سزا دیں گے۔ لیکن ایک مرتبہ پورے ماحول کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب مولائے کائنات نے یہ فیصلہ سنایا کہ ان میں سے ایک کا عقد میرے فرزند حسین کے ساتھ ہوگا اور دوسری کا عقد محمد بن ابی بکر کے ساتھ ـــــ یعنی امامت کی نسل میں بھی یہ شرافت چلے گی اور حکومت کی نسل میں بھی اور میں تو سمجھتا ہوں کہ محمد سے عقد کرنے میں شاید ایک مصلحت یہ بھی رہی ہو کہ حکومت کا

بس چلتا تو قومیت کا فساد پھیلا کے اسلام میں تفریق پیدا کر دیتی ــــ یہ امامت ہے کہ اسے اختیار ملتا ہے تو حکومت کے ایوان کو بھی قومی تفریق کے مٹانے کا مرکز بنا دیتی ہے۔

عقد ہو گیا اور بظاہر عقد کوئی اتنا اہم مسئلہ بھی نہیں تھا لیکن حالات و ماحول کا جائزہ لیا جائے تو اس عقد کی صحیح عظمت و اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ امام حسینؑ جیسا عظیم الشان اور عظیم المرتبت انسان جس پر ذاتی شرافت اور نسبی نجابت دونوں کو ناز تھا۔ ہاشمی گھرانہ۔ ابو طالب کا لال۔ پیغمبر اسلامؐ کا نواسا۔ بھلا کون گھرانہ تھا جہاں حسینؑ کا پیغام دیا جاتا اور انکار ہو جاتا۔ کون سا انسان تھا جو حسینؑ کی دامادی پر ناز نہ کرتا۔ لیکن یہ مولائے کائناتؑ کا کمال کردار تھا کہ آپ نے ایک عجمی خاتون کو اپنی بہو بنا کر دنیا پر واضح کر دیا کہ قومی تعصب کا شکار ہونا تمھارا کام ہے اور قومی تفریق کو مٹا کر فنا کر دینا ہمارا کام ہے۔ اور شاید یہی راز تھا کہ قدرت نے بھی اس کا یہ انعام دیا کہ عجم کو فتح کرنے کا کام حکومت نے کیا اور کلمہ آج تک امامت ہی کا پڑھا جا رہا ہے۔ جو اسلام بزور شمشیر پھیلتا ہے وہ فنا ہو جاتا ہے اور جو اسلام بزور کردار آگے بڑھتا ہے وہ زندہ و پائندہ ہو جاتا ہے۔

ماحول پر لاحول پڑھنے کی تاریخ میں یہی دو عظیم مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بیٹی کو زندہ دفن کر دینے والے سماج کے سامنے بیٹی کی تعظیم کے لئے اٹھنا اور ایک عرب و عجم کے تعصب کی ماری ہوئی قوم کے سامنے عجمی قیدی خاتون کو بہو بننے کا شرف دینا اور حسن اتفاق سے یہ دونوں مثالیں ایک ہی خانوادہ میں ملتی ہیں۔ بیٹی کی عظمت کا اظہار نبیؐ نے کیا ہے اور عرب و عجم کی تفریق کو مٹا دینے کا سہرا وصی کے سر رہا ہے۔ نہ کل نبیؐ نے یہ پرواہ کی کہ میرا سماج کیا کہے گا اور نہ آج وصی کو اس کی فکر ہے کہ لوگوں پر

اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ کل پیغمبرؐ یہی سوچ رہے تھے کہ جو قابل تعظیم ہے اسکی تعظیم ہونی چاہیئے چاہے سارا سماج مخالف ہو جائے اور آج علیؑ یہی سوچ رہے ہیں کہ جسے مرسل اعظمؐ نے خواب میں بشارت دی ہے اسے بہو بنانا ہے چاہے ساری دنیا مخالف ہو جائے۔ دنیا کا منہ دیکھ کر عمل کرنے والے دنیا دار ہوتے ہیں اور دنیا سے مُنہ موڑ کے مرضیِ پروردگار تلاش کرنے والے "اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ" کے مصداق ہوتے ہیں۔

عقد ہوا اور بڑے اہتمام سے ہوا۔ عجمیت کی عزت بڑھی۔ عربیت کا غرور شا اور ایک قیدی خاتون خاندان رسالت کی بہو بن گئی۔ دنیا نے تعصب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ یہ کیسا انقلاب آیا اور یہ کیا ہوگیا ——؟ قدرت نے غرور کے مُنہ پر ایک اور طمانچہ مارا کہ کل جس عجم خاتون کی زوجیت برداشت نہیں ہو رہی تھی اور لوگ حیرت سے امامت کا منہ دیکھ رہے تھے آج وہی خاتون ایک امام وقت کی ماں قرار پا رہی ہے۔ ۱۵ رجمادی الاولیٰ کی وہ مبارک تاریخ آئی جب شہربانو کی گود آباد ہوئی اور قدرت نے انھیں وہ فرزند عنایت کیا جو بزم عابدین کی رونق اور کاروان ساجدین کا سردار قافلہ ہے۔

قدرت نے جو امیہ سے باقاعدہ طور پر سر دربار ٹکرانے کا کام انھیں عجم خاتون کے فرزند کے ذمہ رکھا اور ایک مرتبہ اموی غرور کو پھر آواز دی کہ عرب عجم کی تفریق پر ناز کرنے والو۔ ذرا فرق تو محسوس کرو۔ کل ایک عجم خاتون علیؑ کے دربار میں آئی تھی تو اسے رشتہ کا شرف عطا کیا گیا تھا۔ اور آج رسولؐ کی بیٹیاں تمھارے دربار میں قیدی بن کر آئی ہیں تو انھیں اس طرح ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے۔ پہچان لو اسلام کس کے پاس ہے اور کس کے پاس نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ سے کس کا رشتہ ہے اور کس کا رشتہ نہیں ہے اور میں تو یہ عرض کروں گا کہ پروردگار نے شام کا تختہ اُلٹنے کا

کام بھی انھیں جناب شہربانو کے فرزند سے لیا تاکہ قید و بند کی مصیبتیں برداشت کر نیوالا دربار کی چولیں ہلا دے تو یزیدیت کو احساس ہو کہ ہاشمی گھرانے کا رشتہ عجم سے بھی ہوتا ہے تو جلال و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا اور اموت عربیت پر بھی ناز کرتی ہے تو شکست خوردہ ہو جاتی ہے۔

بعض مورخین نے جناب شہربانو کی آمد کو خلیفہ دوم کے دور میں لکھا ہے اور اور یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ یہ "خلافت مآب" کا احسان تھا کہ انھوں نے شہربانو کا عقد امام حسینؑ سے کرادیا لیکن اولاً تو یہ داستان بالکل بے بنیاد ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں احسان یا تعلقات کا کوئی دخل نہیں ہے اس روایت کا مضمون یہی ہے کہ خلیفہ وقت نے انھیں کنیز بنا کر بیچنے کا ارادہ کیا تو امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ شہزادیاں فروخت نہیں ہوتیں اور اس طرح بھی دونوں شخصیتوں کا کردار کھل کر سامنے آگیا کہ دولت کی ہوس کہاں ہے اور عزت کی پاسداری کہاں ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہاں عقد کی داستانیں گڑھنے کی بیماری ہے اور ہر رشتہ میں اپنا دخل ضروری ہے۔ کبھی عقد شہربانو میں اپنا حصہ ثابت کیا جائے اور کبھی عقد ام کلثوم کی داستان وضع کی جائے۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام ہے کہ جو روایت بھی تیار کی گئی اس میں مذمت ہی کا پہلو نکلا۔ مدح نہ نکل سکی۔ آل محمدؐ سے رشتہ جوڑنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ جب کوئی نا اہل رشتہ جوڑا گیا تو نتیجہ میں حقیقت کھل کر سامنے آگئی اور قدرت نے واضح کر دیا کہ جنھیں رشتہ کا پاس و لحاظ نہیں ہے انھیں کمالات و فضائل کا کیا خیال ہوگا۔

یہ حادثہ ضرور ہے کہ جناب شہربانو کا انتقال اپنے فرزند کی ولادت کے دس دن کے اندر ہی ہو گیا اور عالم ظاہر میں اپنے لال کے کمالات کا مشاہدہ نہ کرسکیں۔

لیکن اس انتظام قدرت میں بھی ایک مصلحت تھی اور اس کا راز اس وقت کھُلا جب بچپنے سے پالنے والی ماں دستر خوان پر بیٹھیں اور امام زین العابدینؑ نے کھانے میں ساتھ نہ دیا اور کسی نے پوچھا کہ فرزند رسولؐ آپ اپنی پالنے والی ماں کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے تو آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میرا ہاتھ اس شے کی طرف نہ بڑھ جائے جس طرف میری ماں کی نگاہ ہو اور اس طرح ماں کے احترام میں فرق آجائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ خاتون واقعی ماں نہیں تھیں اور امام کے بارے میں یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرف ہاتھ بڑھا دیں گے جس طرف ماں کی نگاہ اُٹھ رہی ہے۔ اس لئے کہ امام معصوم اور صاحب علم غیب ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایسے اقدامات کا امکان نہیں ہے لیکن بتانا یہ ہے کہ جب میں ایک پرورش کرنے والی ماں کا اتنا احترام کرتا ہوں تو حقیقی ماں کا احترام کیا ہوگا ـــــ

امام کا مقصد قطعًا یہ نہیں تھا کہ میرا ہاتھ اُدھر بڑھ جائے گا جدھر ان کی نگاہ ہے بلکہ مقصد یہ تھا کہ اُن کا ہاتھ ادھر بڑھ سکتا ہے جدھر میرا ہاتھ بڑھ رہا ہے اس لئے کہ میں صاحب علم غیب ہوں اور وہ عالم غیب نہیں ہیں۔ یہ ایک اخلاق آل محمدؐ ہے کہ بیان کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ دامن تہذیب و احترام پر دھبہ نہ آنے پائے اور میرے اس دعویٰ کی دلیل وہ واقعہ ہے کہ جب معصومۂ عالم کی وفات کے بعد شہزادے گھر میں آئے اور جناب اسماء نے کھانا پیش کیا اور شہزادوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے کبھی ماں کے بغیر کھانا نہیں کھایا۔ سوال یہ ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ماں کے بغیر کھانا نہیں کھاتے اور ان کے فرزند کا یہ عالم ہے کہ وہ ماں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے

کیا امامت کے کردار میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور کیا امام کا انداز بھی دنیا والوں کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ راز صرف یہ ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور حضرت زین العابدینؑ کے حالات میں ایک نمایاں فرق ہے ان کی ماں معصومہ تھیں۔ وہاں کسی طرف سے غلطی کا امکان نہیں تھا اور یہاں امام زین العابدینؑ کی ماں غیر معصومہ ہیں۔ غیر معصومہ کے اقدام میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ سیرت اختیار کی ــــ

امام زین العابدینؑ کا دورِ حیات اس انداز سے گذرا کہ ۳۸ھ سے ۴۰ھ تک دادا کے زیر سایہ رہے۔ ۴۰ھ میں مولائے کائنات کی شہادت کے بعد ۵۰ھ تک کا زمانہ باپ اور چچا کے ساتھ گذرا۔ ۵۰ھ کے بعد ۶۱ھ تک باپ کے ساتھ رہے اور ۶۱ھ کے بعد سے ۳۵ سال تک تنہا زندگی گذاری اور آپ کے شریک کار آپ کے فرزند امام محمد باقرؑ رہے۔ جن کی عمر واقعہ کربلا میں صرف ۳ سال تھی۔

یعنی یوں کہا جائے کہ امام زین العابدینؑ نے دنیا میں قدم رکھا تھا تو شہزادگی کے عالم میں۔ ماں شہزادیٔ عجم۔ باپ شہزادۂ عرب۔ دادا حاکم اسلام اور خلیفۃ المسلمین ــــ لیکن دو ہی برس میں یہ بساط اُلٹ گئی۔ ادھر ماں کا انتقال ہوا۔ ادھر دادا کی شہادت ہوئی۔ ادھر مصائب کا ہجوم۔ ادھر واقعہ کربلا ــــ واقعہ کربلا کے بعد تاراجی مدینہ ــــ تاراجی مدینہ کے بعد غارت گری مکہ ــــ غرض کہ امام کی پوری زندگی مصائب برداشت کرنے میں گذر گئی لیکن ان مصائب کا نہ کردار پر کوئی اثر پڑا نہ خدمت اسلام پر۔ بلکہ مصائب نے خدمت کا اور موقع دے دیا اور تاریخ کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ آپ نے دین اسلام کو اس وقت زندہ کیا

جب کوئی دوسرا زندہ کرنے والا نہیں تھا۔ سرکار سید الشہدا معاف فرمائیں۔ میرا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ امام حسینؑ حفاظت اسلام کے لئے اُٹھے تو انھیں کم از کم ۷۲ ساتھی مل گئے لیکن امام زین العابدینؑ نے اس وقت یہ ذمہ داری سنبھالی ہے جب چند خواتین اور ایک کمسن فرزند کے سوا کوئی نہ تھا اور پھر مقصد کو اس طرح بچایا کہ دین بھی رہ گیا اور دین والے بھی رہ گئے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں جو نسل رسولؐ اور سادات کرام کا سلسلہ ہے وہ کرم ہے اسی وجود امام زین العابدینؑ کا اور صدقہ ہے اسی محافظ اسلام کا کہ اس نے مصائب برداشت کرکے اتنی بڑی قوم بھی بچا لی اور اتنا عظیم مذہب بھی بچا لیا اور اب کہنا پڑتا ہے کہ امویت آکے دیکھے "انا اعطیناک الکوثر" کسے کہتے ہیں جس کی نسل میں ایک کے باقی رہنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس کی نسل میں ایک سے کتنے ہو گئے۔ اب اگر امام زین العابدینؑ کو آدم آل محمدؐ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آدمؑ کی نسل طوفان نوح میں تباہ ہو گئی اور نوح آدم ثانی قرار پا گئے لیکن امام زین العابدینؑ نے جو نسل چھوڑی ہے اس پر کسی طوفان اور سیلاب کا زور بھی نہیں چل سکا اور کیوں نہ ہوتا۔ جنتی ماحول کے پروردہ ماں باپ کی نسل طوفانوں کو برداشت نہیں کر سکتی لیکن کربلا کے مصائب جھیلنے والے بزرگوں کی نسل پر طوفانوں اور سیلابوں کا اثر نہیں ہو سکتا۔

کیا کہنا اس امام سجادؑ کا جس کی زندگی میں ہر شے نرالی ہے اور جس کی فضیلت کا ہر گوشہ نیا ہے۔ ماں شہزادی عجم۔ باپ سردار جنت۔ خود آدم آل محمدؐ سجدہ زینت ساجدین۔ عبادت رونق عابدین۔ کتاب زبور آل محمدؐ۔ صحیفہ انجیل اہلبیتؑ۔ خوشی مرضی پروردگار اور تکلم فاتح دربار و بازار۔

آپ کے مشہور القاب زین العابدین اور سید الساجدین ہیں۔ عبادت کرنے والوں کی

زینت اور سجدہ گذاروں کا سردار۔ عبادت کا یہ عالم ہے کہ باغ میں ۵۰۰ درخت ہیں اور روزانہ ہر درخت کے نیچے دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں اور دنیا کو محسوس کرایا جاتا ہے کہ شکر پروردگار ادا کرتے والے ایسے ہوتے ہیں ہزاروں نعمتیں کھا کر نام خدا نہ لینے والے اور ہوتے ہیں اور ایک ایک برگ و ثمر پر شکر خدا ادا کرنے والے اور۔

اور جب کسی نے آکر عرض کی فرزند رسولؐ۔ آپ بیحد عبادت کرتے ہیں اتنی عبادت کس کے امکان میں ہے تو آپ نے فرمایا بیٹا محمد باقرؑ ذرا وہ صحیفہ تولاؤ جس میں میرے جد امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب کی عبادتوں کا تذکرہ ہے۔ امام محمد باقر صحیفہ لائے۔ آپ نے سامنے رکھ کر فرمایا۔ ذرا میرے جد کی عبادتوں کا حال تو دیکھو۔ اور یہ کہہ کر ارشاد فرمایا کہ کس کی مجال ہے جو علیؑ کی منزل عبادت تک پہونچ سکے ——

میں عرض کروں گا مولا۔ آپ زین العابدینؑ ہیں۔ بزم عابدین کی زینت ہیں۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کی عبادت کے برابر کس کی عبادت ہو سکتی ہے؟ آپ فرمائیں گے تجھے نہیں معلوم میری عبادت یقیناً ایسی ہے کہ پروردگار نے مجھے زین العابدینؑ قرار دیا ہے اور روز قیامت مجھے اسی لقب سے پکارا جائے گا لیکن میری عبادتوں کا سارا زور میری نمازوں سے ہے میرے سجدوں سے ہے۔ میرے تضرع و زاری سے ہے۔ میرے خضوع و خشوع سے ہے۔ میری خاکساری سے ہے۔ میری بندگی سے ہے۔ لیکن میرے جد کا تو یہ عالم تھا کہ ان کی ایک ضربت عبادت ثقلین پر بھاری تھی تو اب سوچو کہ جس کی ایک ضربت کا یہ عالم ہے اس کی ساری ضربتیں کیسی ہوں گی اور جس کی ضربتوں کا یہ عالم ہوگا اس کی نمازیں کیسی ہوں گی۔ اس کے سجدے کیسے ہوں اس کی عبادتیں کیسی ہوں گی اور اس کی بندگی کی شان کیا ہوگی —— ؟

اس کے بارے میں تو صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مصلے پر آجائے تو بھی عبادت اور مصلے چھوڑ کر سو جائے تو بھی عبادت۔ سجدہ میں جھک جائے تو عینِ رضائے پروردگار اور بسترِ رسولؐ پر سو جائے تو رضائے پروردگار کا سودا ـــــ

عبادتوں کی اس کثرت میں بھی محویت اور توجہ کا یہ عالم تھا کہ ابلیس ملعون اژدہے کی شکل میں مصلیٰ کے قریب آتا ہے اور آپ کے پائے اقدس کے انگوٹھے چبانے لگتا ہے اور جب آپ کے خضوع و خشوع میں کوئی فرق نہیں آتا ہے تو عاجز آکر چلا جاتا ہے اور فضا میں ایک آواز گونجی ہے۔ "انت زین العابدین" تو زینت عابدین ہے۔ تیری عبادت پر شیطان کا اثر نہیں ہے۔ تیری توجہ پر دنیا کی کوئی طاقت اثر نہیں ڈال سکتی۔

اس مقام پر چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ شیطان اژدہے کی شکل میں کیوں آیا۔ کیا کوئی اور شکل ممکن نہیں تھی۔ وہ تو مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ پھر یہی شکل کیوں پسند آئی۔ شاید راز یہ رہا ہو کہ اسی شکل میں آدم کے پاس آکے آزما چکا تھا اور" اپنے خیال میں" کامیاب بھی ہو چکا تھا تو چاہا کہ اس آدم کو بھی اسی انداز سے اپنی طرف کھینچ لیا جائے لیکن جلالِ امامت نے آواز دی۔ ابلیس آدمؑ کی منزل اور ہے۔ سید الساجدینؑ کی منزل اور۔ تو نے اتنا تو سوچا ہوتا کہ تو نے خود بھی اقرار کر لیا تھا کہ مخلص بندوں کو نہیں گمراہ کر سکوں گا تو اب کس لئے آیا ہے۔ ابلیس کہے گا میں بھی یہی چاہتا تھا کہ دنیا پہچان لے کہ جن بندوں کے مقابلہ میں میں نے شکست کا اقرار کیا ہے وہ ایسے بندے ہیں۔ دنیا داروں کے مقابلہ میں شکست کا اقرار نہیں کرتا۔

واقعہ کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب امامؑ نماز توڑ دیں گے۔

جان بچانے کی فکر کریں گے۔ اذیت سے فرار کریں گے اور کچھ نہ ہوگا تو کم از کم سانپ کو دیکھ کر رو دیں گے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ نہ گریہ ہے نہ فرار۔ نہ پریشانی ہے نہ اضطراب۔ میں عرض کروں گا مولا! یہ آپ کا کیا عالم ہے۔ ایسے حالات میں ایسا سکون؟ آواز دیں گے فرار کا بیٹا ہوتا تو فرار کر جاتا۔ حیدر کرار کا لال ہوں۔ دنیا کا نمائندہ ہوتا تو سانپ کو دیکھ کر رونا شروع کر دیتا لیکن نمائندہ پروردگار ہوں، رونے کا کیا سوال ہے۔

عرض کروں گا مولا! یہ سب کچھ صحیح ہے۔ ہماری جانیں نثار، بیشک آپ نمائندۂ پروردگار ہیں۔ فرزند رسولؐ۔ زین العابدین ہیں۔ سید الساجدین ہیں فاتح کوفہ و شام ہیں۔ جان حسینؑ اور وارث حسنؑ ہیں۔ لیکن مولا یہ بھی اژدہا ہے۔ موذی ہے کاٹنے والا ہے۔ زہریلا ہے۔ آپ فرمائیں گے یہ سب صحیح ہے لیکن میں علیؑ کا لال بھی ہوں۔ کاش تم نے علیؑ کی تاریخ بھی پڑھی ہوتی تو تمھیں تعجب نہ ہوتا۔ جب ایک علیؑ گہوارے میں اژدہے کے دو ٹکڑے کر سکتا ہے تو دوسرا علیؑ نماز میں مطمئن کیسے نہیں رہ سکتا اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں الٰہی نمائندہ ہوں اور الٰہی نمائندوں کی شان یہ ہے کہ وہ سانپ سے نہیں ڈرا کرتے۔ موسیٰ قوم کی گمراہی سے خائف تھے سانپ سے نہیں۔ تم نے دیکھا ہے کہ سانپ غار میں آیا تو نبیؐ نہیں ڈرے اور گہوارے کے پاس آیا تو علیؑ نہیں ڈرے۔ تو جس گھر میں ڈرنے کی رسم ہی نہیں ہے وہاں ڈرنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوال تو وہاں ہوتا ہے جہاں ڈرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

امام کے سجدوں کے بارے میں یہ امتیاز بھی قابل توجہ ہے کہ آپ نے جن حالات میں سجدہ کیا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ یوں تو آپ کی

زندگی کا معمول تھا کہ ہر نعمت پر سجدہ ۔ ہر آیت سجدہ پر سجدہ ۔ ہر نماز کے بعد سجدہ اور ایسا سجدہ کہ پیشانی پر گھٹے پڑ گئے تھے اور ہر سال اسے جدا کیا جاتا تھا لیکن ان سجدوں کے درمیان وہ سجدہ جو عصر عاشور کے بعد کربلا کی خاک پر ہوا ہے ۔ وہ سجدہ جو جلے ہوئے خیام کی راکھ پر ہوا ہے ۔ وہ سجدہ جو شام غریباں کے سناٹے میں ہوا ہے ۔ وہ سجدے جو شام کے زندان میں ہوئے ہیں ۔ یہ وہ سجدے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں مل سکتی اور دنیا جانتی ہے کہ عمل کی اہمیت حالات کے اعتبار سے بڑھ جایا کرتی ہے ۔ پرُسکون حالات میں نماز اور ہوتی ہے اور مصائب و آلام کے ہجوم میں سجدہ اور ۔ سردی کے سکون آمیز دور میں روزے اور ہوتے ہیں اور گرمی کی تپش خیز ہوا میں روزے اور ـــــ مکہ میں رہ کر حج کرنا اور ہوتا ہے اور مدینہ سے چل کر پیدل حج کرنا اور ـــــ یہ آل محمدؐ کا امتیاز تھا کہ انھوں نے ہر عمل میں اپنی انفرادیت محفوظ رکھی ہے اور کسی منزل پر دامن بندگی کو ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا ۔ سجدہ کا ذکر آگیا ہے تو یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھ لیجیے کہ امام زین العابدینؑ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے خاک شفا کی تسبیح اور سجدہ گاہ ایجاد کی ہے ۔ اس سے پہلے معصومۂ عالم کی زندگی میں تسبیح کا ذکر ملتا ہے لیکن دھاگے میں گرہیں بنا کر یا قبر جناب حمزہ کی خاک سے ۔ امام زین العابدینؑ نے خاک کربلا سے تسبیح بنائی ہے اور اور گویا یہ واضح کر دیا ہے کہ تسبیح پروردگار کے لئے موزوں ترین خاک قبر سید الشہداء کی خاک ہے ۔ اپنے دور میں حمزہ سید الشہداء تھے تو دادی نے ان کی قبر کی مٹی سے تسبیح بنائی تھی اور اب میرا باپ سید الشہدا ہے تو میں نے اس کی خاک قبر سے تسبیح تیار کی ہے اور اس خاک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر تسبیح پڑھنے والا خاموش بھی ہو جاتا ہے تو تسبیح کے دانے خود ذکر پروردگار کرتے رہتے ہیں ۔ اور کیوں

نہ ہوتا جس خاک میں خونِ حسینؑ جذب ہو گیا ہو اس کا ذرہ ذرہ تسبیح پروردگار نہ کرے گا تو کیا کرے گا۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ گلے سے لہو کی دھار نکلتی ہے تو "بقول اقبالؒ نقش الا اللہ ہی ثبت ہوتا ہے ____

چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ آپ کے دست مبارک میں تسبیح تھی اور آپ محو گفتگو تھے۔ درمیان گفتگو تسبیح کے دانوں کو گردش دیتے جا رہے تھے۔ کسی نے ٹوک دیا کہ آپ تسبیح سے کھیل رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا تجھے اس خاک کی حقیقت کیا معلوم؟ یہ خاک خود تسبیح پروردگار کر رہی ہے۔

کیوں نہ ہو ایک امام کی خاک قبر ہے اور ایک امام کا دست حق پرست۔ ایک سجدہ گذار کی تربت ہے اور ایک سید الساجدین کا ہاتھ۔ اب تسبیح میں کیا کسر باقی رہ جاتی ہے۔

خاک کربلا کی سجدہ گاہ بھی آپ ہی کی ایجاد ہے۔ اس کے پہلے پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ میں سجدہ گاہ کا رواج تھا اور مختلف اسلامی حدیثوں میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ آپ جانماز کے علاوہ ایک کھجور کا ٹکڑا بطور سجدہ گاہ استعمال کیا کرتے تھے۔

اب میں نہیں جانتا کہ حضور کو جانماز پر سجدہ کرنے میں کیا زحمت تھی کہ الگ سے ایک شے رکھا کرتے تھے اور حضور کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اس طرح بت پرستی کا الزام آجائے گا اور اگر ایسا نہیں ہے اور حضور جان بوجھ کر الگ شے پر سجدہ کر رہے تھے تو ماننا پڑے گا کہ سجدہ گاہ پر سجدہ کرنا بدعت نہیں بلکہ سجدہ گاہ کو ہٹا کر سجدہ کرنا بدعت ہے۔

اور اس سے بالاتر یہ کہا جائے کہ اگر سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے سے بت پرستی کا الزام آتا ہے تو ہم سے پہلے یہ الزام سرکار دو عالمؐ پر آئے گا۔ لیکن حیرت ہے کہ

کل کسی شخص نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ہم میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ ہمارے سامنے بھی ایک بت ہوتا ہے اور آپ کے سامنے بھی ایک شے ہوتی ہے۔ اگر مشرک ہیں تو ہم دونوں اور اگر موحد ہیں تو ہم دونوں ــــ لیکن مرسل اعظم سجدہ کرتے رہے اور نہ کسی صحابی نے ٹوکا نہ کسی کافر نے اعتراض کیا۔ یہ شعور آج ہی کے مسلمانوں میں پیدا ہوگیا ہے اور یہ فکر آج ہی کے مسلمان کو لاحق ہوگئی ہے کہ اس طرح بت پرستی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

مجھے یہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ بت پرستی کے معنی بت کو سجدہ کرنے کے ہیں بت پر سجدہ کرنے کے نہیں ہیں اور سجدہ گاہ میں سجدہ گاہ پر سجدہ ہوتا ہے..... سجدہ گاہ کو سجدہ نہیں ہوتا۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ یہ فرق کل کے کافر کو معلوم تھا اور آج کے مسلمان کو معلوم نہیں ہے۔ تو اب دو ہی باتیں ہیں یا مسلمان تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوگیا ہے اور افتراق و اختلاف کو برقرار رکھنے کے لئے الزام لگاتا ہے تو بہتان تراشنے والوں کی سزا جہنم ہے ــــ یا مسلمان اتنا بھولا اور ناواقف ہوگیا ہے کہ اسے بت اور سجدگاہ کا فرق معلوم نہیں ہے تو ایسے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جاہلیت زدہ کفار سے سبق لے اور یہ دیکھے اسے اب اتنا بھی شعور نہیں رہ گیا ہے جتنا کل کے جاہلیت زدہ کافر میں تھا۔ سچ ہے جو ذہن بت پرستی کے سایہ میں پرورش پاتا ہے اسے ہر منزل پر بت پرستی ہی نظر آتی ہے۔ یہ مسلمان کسی بت شکن کا پرستار ہوتا تو یہ خیال ہی ذہن میں نہ پیدا ہوتا۔

عبادت کے سلسلے میں دو چھوٹے چھوٹے واقعات کی طرف اور بھی اشارہ کرکے بیان کو تمام کردینا چاہتا ہوں۔ واقعات اپنی ظاہری حیثیت کے اعتبار سے چھوٹے اور مختصر ہیں لیکن افادیت اور درسِ بندگی کے اعتبار سے بےحد اہمیت رکھتے

ہیں۔ کاش مسلمان معصومینؑ کی سیرت کے انھیں چھوٹے چھوٹے واقعات پر نظر رکھتے تو آج زندگی کا خاکہ کچھ اور ہی ہوتا اور سماج میں جو بات پیدا ہو گئی ہے وہ ہرگز نہ ہوتی۔ ساری خرابی یہ ہے کہ سیاست دنیا کو مذہب کا جزء بنا دیا گیا ہے اور مذہب کے مسائل اہل سیاست کی سیرت کی روشنی میں حل کئے جا رہے ہیں جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ خود اہل سیاست نے بھی اپنے مذہبی مسائل خود حل نہیں کئے ہیں بلکہ اہلبیتؑ ہی کی چوکھٹ پر آئے ہیں اور جب مسائل حل ہو گئے ہیں تو یہ اعلان کر دیا ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے ـــــ

امام محمد باقرؑ کی کمسنی ہے۔ چند برس کی عمر ہے۔ امام زین العابدینؑ مصروف عبادت ہیں۔ اتفاق سے کمسن شہزادہ کنویں میں گر جاتا ہے۔ ہر طرف سے ایک شور برپا ہو گیا۔ نکالنے کی تدبیریں شروع ہو گئیں۔ لیکن نہ گرنے والا کنویں میں شور مچاتا ہے اور نہ نماز پڑھنے والا اپنی نماز توڑتا ہے۔ سکون و اطمینان سے عبادت ہو رہی ہے اور لوگ پریشان ہیں۔ یہاں تک کہ نماز تمام ہوئی۔ زوجہ نے عرض کی۔ فرزند رسولؐ! یہ عجب انداز عبادت ہے کہ بچہ کنویں میں ہے اور آپ نماز کو طول دیئے جا رہے ہیں۔ ایسے موقع پر تو نماز توڑ دینا بھی جائز ہو جاتا ہے ـــــ فرزند رسولؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کنویں کے قریب آئے اور آواز دی۔ لا میری امانت کو واپس کر۔ یہ سننا تھا کہ پانی بلند ہوا ـــــ اور سطح کے قریب آیا۔ امام نے بچے کو اٹھا لیا اور ماں سے کہا لے اپنے فرزند کو ـــــ اور اتنا تو یقین کر لے کہ میں جس کی بندگی میں مصروف ہوں وہ میرے فرزند کی حفاظت ضرور کرے گا ـــــ امام کا ارشاد بھی صحیح ہے اور ماں کا اضطراب بھی حق بجانب ہے۔ امام بہرحال امام ہیں۔ ماں امام نہیں ہے۔ اس کے پاس ماں کی وہ دولت ہے جو پریشان کئے ہوئے ہے۔ اس سے آپ یہ خیال کریں

معاذاللہ ماں کے ایمان ویقین میں کوئی کمی آگئی ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ بشریت کے تقاضے ہیں جن پر عمل کیا جارہا ہے اور یہی تقاضے جب دب جاتے ہیں تو عصمت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

امامؑ کا اطمینان آواز دے رہا ہے کہ مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جب کنواں یوسف کی جان نہیں لے سکا تو فرزیوسف کو کیسے ہلاک کرسکتا ہے اور یاد رکھو۔ یہ اتفاقی حادثات نہیں ہیں کہ انسان مضطرب ہوجائے۔ اتفاق سے وہ گرتا ہے جس کے پیر میں لغزش آجاتی ہے۔ میرا فرزند معصوم ہے اس کے قدم میں لغزش کا سوال نہیں ہے۔ یہ تو ایک امتحان قدرت اور اہتمام ہدایت تھا کہ میرا خلوص بھی ظاہر ہوجائے اور بچے کا سکون بھی سامنے آجائے۔ امت کے لئے درس ہدایت بھی فراہم ہوجائے کہ شدت مصائب میں بھی مالک کائنات پر اعتبار کرنا چاہیئے اور پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ اور وہ کیسے پریشان ہوگا جو نماز میں مصلے پر آکر اپنے پروردگار سے محو گفتگو ہو اور ــــ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کی تلاوت کررہا ہو۔ اضطراب اُن کا حصہ ہے جو اطاعت شیطان کرکے نماز چھوڑ دیتے ہیں اور اس لائق نہیں رہ جاتے کہ پروردگار کی بارگاہ میں حاضری دے سکیں۔ اور اطمینان ان کا حصہ ہے جو زندگی عبادت الٰہی میں بسر کرتے ہیں اور اتنی عبادت کرتے ہیں کہ پروردگار انھیں زین العابدینؑ کا لقب دے دیا کرتا ہے۔

تاریخ میں ایک واقعہ اور ملتا ہے کہ امامؑ مصروف نماز تھے اور اتفاقاً گھر میں آگ لگ گئی۔ چاروں طرف سے شور برپا ہوگیا۔ لوگ بجھانے کی فکر میں لگ گئے اور امامؑ کی نماز کو طول ہوتا جارہا ہے۔ خدا خدا کرکے نماز تمام ہوئی تو کسی نے بڑھ کر عرض کی۔ فرزند رسولؐ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے اور آپ کو فکر ہی نہیں ہے۔ یہ کون سا انداز عبادت

ہے کہ انسان اس قدر غافل ہو جائے ؟ فرمایا۔ بھائی مجھے وہاں کی آگ نے یہاں کی آگ سے غافل بنا دیا تھا۔

یہ ہے انداز تبلیغ۔ ایک لفظ نے ذہن کا دھارا موڑ دیا۔ کوئی صاحب ایمان انسان ہے جو اس فقرہ کو سننے کے بعد ایک لمحہ کے لئے چونک نہ جائے۔ اور کوئی صاحب شرافت ہے جس کے ذہن میں عبادت الٰہی کی اہمیت کا شعور بیدار نہ ہو جائے۔ ایک معصوم اور آخرت کی آگ کا اتنا خیال اور ہم غیر معصوم اور اس قدر غافل ــــ میں تو یہ عرض کروں گا کہ معصوم نے دو مسئلے بیک وقت حل کر دئے۔ یہ بھی بتا دیا کہ جسے آخرت کا خیال ہوتا ہے اسے دنیا کے مصائب کی پرواہ نہیں ہوتی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ جو اُدھر متوجہ ہو جاتا ہے اس کا اِدھر کا انتظام خود بخود ہو جایا کرتا ہے۔ میں نماز توڑ بھی دیتا تو کیا کرتا آگ ہی تو بجھاتا۔ وہ کام تو بالآخر ہو ہی گیا اور میرے خلوص میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی غیر ذمہ دار ہو جائے اور گھر میں آگ لگا کر نماز شروع کر دے۔ نہیں نہیں اسلام مقابلہ کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام خلوص کا مذہب ہے۔ اب ساری دنیا بھی ایسا ہی عمل کرے تو امام کی منزل کو نہیں پہونچ سکتی۔ ان کا عمل ان کے خلوص کی پیداوار تھا اور یہ عمل ان کے عمل کی پیداوار ہوگا۔ یہ ایمان و یقین کی ایک منزل ہے جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتی۔ بس انسان کا فرض ہے کہ ایسا یقین ایسا ایمان۔ ایسا عقیدہ اور ایسا عمل پیدا کرے کہ مسائل حیات خود بخود حل ہو جائیں اور عبادت الٰہی میں فرق نہ آنے پائے۔ یہ عبادت سے کنارہ کشی ہی کا اثر ہے کہ آج زندگی میں بے شمار مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور حل کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ انسان نصرت الٰہی پر اعتماد کرتا تو نہ آگ سے مرعوب ہوتا نہ پانی سے۔ شہزادہ کنویں میں گرا تو امام کے خلوص عمل پر اثر نہیں پڑا اور گھر میں آگ لگی تو اخلاص عبادت پر کوئی اثر

نہیں پڑا۔ اور یہ کہنا پڑا کہ میں نے انھیں دونوں واقعات میں کردار کے دو عظیم جلوے دیکھے ہیں۔ کل بھی ابراہیمؑ کو آگ میں جاتے دیکھا تھا اور موسیٰؑ کو پانی میں اور وہاں بھی سکون ہی نظر آیا تھا ــــ بس فرق یہ ہے کہ وہاں آگ حکم خدا سے گلزار ہوگئی تھی اور موسیٰؑ حکم خدا سے نیل کی موجوں میں رہے اور زندہ رہے اور یہاں حکم خدا نہیں ہے بلکہ بندگی خدا ہے جو آگ کو خاموش کئے ہوئے ہے اور پانی کو فرمانبردار بنائے ہوئے ہے۔ ہمت نہیں ہے لیکن ایک فقرہ کہہ کے بیان کو تمام کرنا چاہتا ہوں کہ جو کام کل براہ راست حکم خدا سے ہو رہا تھا وہ کام آج بندگیِ خدا سے لیا جا رہا ہے اب جو حکم خدا کے سہارے زندہ رہے وہ جناب ابراہیمؑ اور جناب موسیٰؑ ہیں اور جس نے بندگی کے سہارے مشیت کو اپنا بنا لیا وہ زین العابدینؑ اور سید الساجدینؑ ہیں۔

چھٹی مجلس — داستانِ عزیمت امام زین العابدینؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشاد رب العزت ہوتا ہے: "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔" آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ رب العالمین نے انسان کی جسمانی تربیت کے ساتھ اس کی روحانی تربیت کی بھی ذمہ داری لی ہے اور یہ طے کر دیا ہے کہ جس طرح انسان کی پیدائش سے پہلے شکم مادر میں اس کا جسمانی اور مادی رزق فراہم کر دیا تھا اسی طرح عالم عقل و شعور میں قدم رکھنے سے پہلے اس کی روحانی اور عقلی تربیت کا انتظام بھی ہوگا۔ اس نے ہر دور میں ہادی مقرر کئے۔ ہر زمانہ میں راہنما بنائے اور ایسے پاکیزہ کردار بنائے کہ ان کی زندگی میں عیب و نقص کا کوئی دھبہ بھی نظر نہ آسکا — ایسے اطاعت شعار کہ اس کی مرضی کے بغیر قدم نہ اٹھائیں۔ ایسے عبادت گذار کہ سجدہ سے سر اٹھانا فرض نہ ہو تو سر سجدہ میں رکھ کر کبھی نہ اٹھائیں۔ ایسے بندے کہ خدائی کا دھوکہ ہو اور ایسے بندہ نواز کہ بندوں میں رہ کر بھی خدا کی شان دکھائی دیں۔

عرب کے مشہور شاعر فرزدق نے امام زین العابدینؑ کی شان میں اسی انداز کی مدح کی تھی کہ اگر تشہد میں "لا" نہ ہوتا تو یہ ایسے کریم تھے کہ زندگی میں کبھی "نہیں" نہ کہتے اور ان کی ہر "نہیں" "ہاں" بن جاتی۔ کتنا حسین نکتہ نکالا ہے اور شاید یہ بھی

دین ہے واقعہ کربلا کی ـــ کہ اگر کربلا کے حادثہ عظمیٰ نے "نہیں" کی قدر و قیمت نہ بتا دی ہوتی تو شاعر کا ذہن اس بلندی کردار تک نہ پہونچ سکتا۔ یہ باپ اور بیٹے کے کردار کا اتحاد ہے کہ وہاں "نہیں" سنائی دی تو بیعت یزید کے نام پر اور یہاں "نہیں" سنائی دی تو تشہد کے موقع پر۔ اور یہ دونوں "نہیں" باپ اور بیٹے میں مشترک ہیں۔ تشہد میں "لا" ہے دونوں کے یہاں ہے اور بیعت یزید سے انکار ہے تو دونوں کے یہاں ہے۔ اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں فرزدق کے کلمہ کو امام حسینؑ کے انکار بیعت سے ملا کر یہ کہوں کہ جس کے یہاں لا الٰہ سلامت ہے اس کے یہاں بیعت یزید سے انکار بھی ہے اور جہاں بیعت یزید سے انکار نہیں ہے وہاں کلمہ "لا الٰہ" بھی ریاکاری ہے ایمان نہیں ہے ـــ

اور یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں خواجہ اجمیری کہہ گئے ہیں "حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ" ـــ اور علامہ اقبال نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے "نقش الا اللہ بر صحرا نوشت"۔ حسینؑ لا الٰہ کی بنیاد بھی ہیں اور حسینؑ ہی الا اللہ کے نقاش بھی ہیں۔ اب جو حسینؑ کا نہیں ہے وہ نہ لا الٰہ کا ہے نہ الا اللہ کا ـــ اور جو لا الٰہ الا اللہ کا نہیں ہے وہ مسلمان کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

عزیزان محترم! میرا موضوع کلام فلسفہ کربلا نہیں ہے اور نہ اس وقت اس سلسلہ میں کوئی تفصیلی بحث کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کے بندے اور اس کے نمائندے ہمیشہ اس کی مرضی کے پابند اور اس کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی قدم اس کی مرضی کے بغیر نہیں اٹھتا۔ وہ بیدار ہو کر میدان میں آتے ہیں تو "راضیۃً مرضیۃً" کی سند لیتے ہیں اور بستر پر لیٹ کر سو جاتے ہیں تو رضائے الٰہی کا سودا کر لیتے ہیں۔

ایسے پاکیزہ کردار بندے یا آسمان پر ملائکہ میں دیکھے ہیں یا زمین پر انبیاء و مرسلین میں۔ ملائکہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ" وہ وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے اور انبیاء کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "جَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا" ہم نے انھیں امام اور راہنما بنایا ہے تاکہ ہمارے حکم سے ہدایت کریں اور ان کی طرف وحی کی کہ نیک عمل کرتے رہیں۔ نمازیں قائم کرتے رہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے رہیں اور یہ سب ہمارے عابد اور عبادت گذار بندے تھے۔

آیت کریمہ میں ایک طرف انبیاء و مرسلین کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور دوسری طرف ان کی شان بھی بیان کر دی گئی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہم نے ذمہ داری معین کر دی اور انھوں نے مقام عمل میں فرار اختیار کیا ـــ نہیں، نہیں۔ ہم نے انھیں ذمہ دار بنایا تو انھوں نے مکمل طور پر اپنی ذمہ داری کو ادا کیا اور اس شان سے ادا کیا کہ ہم نے انھیں "عابدین" کی سند دے دی اور ان کی عبادت کا اعلان کر دیا ـــ لیکن یاد رکھو کہ ہم نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے انھیں امام بنا دیا اور نیک عمل نماز۔ زکوٰۃ کی نصیحت کر دی تو وہ عابدین گئے۔ بلکہ ہم نے واضح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ عابد تھے اس لئے ہم نے انھیں منصب امامت عطا کیا ہے۔

ارباب نظر! غور فرمائیں کہ مالک کائنات نے کیا ارشاد فرمایا ہے ـــ یہاں عبادت گذاری منصب کے بعد نہیں ہے کہ انبیاء کو اپنا جیسا بشر فرض کر لیا جائے منصب عبادت کے بعد ہے کہ اگر منصب کا اعلان دنیا میں ہوا ہے تو شان عبادت یہاں دیکھنا ہوگی اور اگر منصب کا اعلان قبل خلقت آدمؑ ہوا ہے تو شان عبادت بھی وہی نظر آئے گی۔ ملاء اعلیٰ کا ماحول ہوگا۔ عالم قدس کی فضا ہوگی۔ کائنات میں سناٹا ہوگا۔ موجودات کا دور دور پتہ نہ ہوگا ایک خالق کا جلوہ ہوگا اور ایک نور مجسم

ہوگا جو محو تسبیح و تہلیل ہوگا اور اسی کی تسبیح و تہلیل سُن کر ملائکہ تسبیح و تہلیل کریں گے۔ وہ استاد ہوگا۔ سید الملائکہ شاگرد ہوگا۔ وہ معلم ہوگا اور عالم عصمت متعلم ہوگا۔ وہ طریقے معین کرے گا اور آسمان والے اس کے نقش قدم پر چلیں گے۔ دنیا والے اس کی راہ پر چلیں یا نہ چلیں آسمان والے جانتے ہیں کہ صراط مستقیم اسی کے نقش قدم کا نام ہے اور نعمتیں انھیں بندوں پر تمام ہوئی ہیں۔ اللہ انھیں کے عمل سے راضی ہے اور دین انھیں کا دین کامل ہے ——

مخلوقات الٰہی میں دو قسم کی مخلوقات معصوم ہیں۔ جن کے دامن کردار پر خطا و غلطی کا کوئی دھبہ نہیں ہے۔ ایک ملائکہ ہیں اور دوسرے انبیاء و مرسلین۔ لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کو اللہ نے اپنے منصب امامت کا اہل سمجھا ہے اور ایک وہ ہے جسے اس منصب کا اہل نہیں سمجھا گیا اور روز اوّل ہی اعلان کر دیا گیا کہ تمھاری تسبیح و تہلیل اپنے مقام پر ہے۔ تمھاری عبادت و بندگی اپنے مقام پر ہے لیکن ہمارا منصب اس سے بالاتر ہے اور ہم ہر عبادت گذار۔ ہر معصوم کردار کو اس کا اہل نہیں سمجھتے۔

اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو منصب اتنا طیب و طاہر ہو کہ معصوم فرشتوں کو نہ مل سکے وہ غیر معصوم بندوں کو کیوں کر مل سکتا ہے ——

میں تو اس سے بالاتر کہنا چاہتا ہوں کہ نگاہ مذہب میں کل عزت آدمؑ یہی ہے کہ انھیں اس عظیم منصب کا اہل قرار دیا گیا جس کے اہل معصوم فرشتے بھی نہیں تھے۔ اسلام میں منصب خلافت فرشتوں کا حصہ نہیں ہے آدم جیسے نیک کردار انسانوں کا حصہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص خلافت و امامت کے منصب سے عصمت کردار کی شرط نکال دے تو وہ عظمت قرآن کا بھی مخالف ہے اور عزت آدمؑ کا بھی۔

اور یاد رکھئے کہ عظمت قرآن سے ایمان وابستہ ہے اور عزت آدم سے آدمیت وابستہ ہے۔ اس منزل میں راہ حق سے ہٹ جانے والا نہ آدمی رہ سکتا ہے نہ صاحب ایمان ـــــ

معصوم مخلوقات میں اللہ نے ایک کو منصب کا اہل بنایا ہے اور ایک کو نہیں ـــــ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرشتوں کے عمل و اخلاص اور ان کے معصوم کردار میں کوئی فرق ہے۔ نہیں۔ اس نے خود فرشتوں کے کردار کی بلندی کا اعلان کیا ہے اور ان کی پیدائشی عصمت کو واضح کیا ہے بلکہ خود آدمؑ کے مسئلہ میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ میرے معصوم فرشتو! تم منصب خلافت کے اہل نہیں ہو لیکن تمھارا فرض ہے کہ جب پیکر آدم میں روح ہدایت پھونک دی جائے تو تم سب کے سب سجدہ میں گر پڑنا ـــــ اس انداز سے تمھاری عصمت کا امتحان ہوگا کہ تم کس قدر اطاعت شعار اور فرماں بردار ہو ـــــ صرف منصب کی طلب ہے یا ذوق بندگی بھی ہے۔ ملائکہ نے سجدہ کر کے بتا دیا کہ ہم بندے ہیں اور ہمارا کام بندگی کرنا ہے۔ ابلیس نے سجدہ سے انکار کر کے واضح کر دیا کہ ہمیں صرف منصب کی ضرورت ہے اور وہ نہ ملے گا تو سجدہ بھی نہ کریں گے ـــــ اور سجدہ بھی تیرا ہوتا تو شاید کر لیتے لیکن یہ کیا غضب ہے کہ آدمؑ کے مقابلہ میں منصب سے محروم بھی کیا اور اب اسی آدمؑ کو سجدہ بھی کرایا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ ملائکہ اور ابلیس میں یہی فرق ہے کہ ملائکہ میں ہوس منصب نہیں ہے ذوق بندگی ہے اور ابلیس میں ہوس منصب ہے ذوق بندگی نہیں ہے اور یہی میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جس میں ہوس منصب کے بجائے ذوق بندگی ہو اسے فرشتوں سے ملایا جائے اور جس میں ہوس منصب ہو اور خلیفۃ اللہ کے سامنے جھکنے کا حوصلہ نہ ہو اسے ابلیس سے ملایا

جائے۔ وہ آدم سے نہیں ملایا جا سکتا ـــــ

ملائکہ نے سجدہ کیا اور "ساجدین" کہلائے۔ ابلیس نے انکار کیا اور مردود بارگاہ الٰہی قرار پایا۔ اب یہ فیصلہ آسان ہو گیا کہ نگاہ قدرت میں مقرب کون ہے۔ اور ابلیس کون ہے؟ دین الٰہی میں سجدہ کی کیا اہمیت ہے اور سجدہ نہ کرنے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک نقطہ کہہ دینا کافی ہے کہ جب آدم کو سجدہ نہ کرنا ابلیس بنا دیتا ہے تو خود پروردگار کو سجدہ نہ کرنا کیا بنا دیگا۔ یہ آپ خود فیصلہ کریں۔

اور تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب آدم کے سامنے سر جھکا دینے والے "ساجدین" بن گئے تو زندگی بھر سجدہ پروردگار کرنے والے کس منصب کے حامل ہوں گے اور ان کا کیا مرتبہ ہوگا ـــــ اس سلسلے میں صرف ایک لفظ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ اللہ نے اپنی دونوں معصوم مخلوقات کا تذکرہ کرتے ہوئے دو لفظیں استعمال کی ہیں۔ انبیاء کے بارے میں لفظ "عابدین" استعمال کیا ہے اور ملائکہ کے بارے میں لفظ "ساجدین" ـــــ

اب ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ اس بندہ پروردگار کا کیا مرتبہ ہوگا تو عابدین کی محفل میں جائے تو زین العابدین بن جائے اور ساجدین کی بزم میں آئے تو سید الساجدین بن جائے۔ اس کا مقابلہ نہ انبیاء سے ہو سکتا ہے نہ ملائکہ سے۔ وہ انبیاء کے بزم کی رونق ہے تو ملائکہ کے کاروان سجود کا میر کارواں ـــــ

اسے ان معصوم مخلوقات سے بھی ملانا۔ اس کا مرتبہ ان دونوں سے بھی بلند ہے۔ وہ انبیاء سے بھی بالاتر ہے اور ملائکہ سے بھی افضل۔ وہ "اہم مسلمان ہیں جو ایسے عظیم کردار کو امت کے گنہگاروں سے ملاتے ہیں اور وہ جاہل قرآن یزید تھا جو ایسے عظیم انسانوں سے مطالبہ بیعت کر رہا تھا۔ کربلا کے راہنماؤں نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ جب مجھ سے انبیاءٔ اور ملائکہ اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتے تو یزید کی کیا بساط اوقات ہے اور امام زین العابدینؑ

نے تو صاف انداز سے واضح کر دیا کہ جب دوسرے علیؑ کو امت کے گنہگاروں سے نہیں ملایا جا سکتا تو پہلے علیؑ کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اور جب دوسرا علیؑ انبیاء اور ملائکہ سے بہتر ہے تو پہلے علیؑ کی کیا منزل ہوگی یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جب حسینؑ کا بیٹا کائنات کے تمام ارباب عصمت سے افضل و بالاتر ہے تو حسینؑ کے باپ کی کیا منزل ہوگی۔

اور شاید اسی لئے پیغمبرؐ اسلام نے کہہ دیا تھا کہ میرے فرزند حسنؑ و حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان سے بھی افضل و بہتر ہیں۔ اب دنیا خود فیصلہ کرے کہ جب سرداروں کو چھوڑ کر جنت نہیں مل سکتی تو ان کے باپ سے لڑ کر کیونکر جنت مل سکتی ہے۔

امام زین العابدینؑ کی زندگی میں افضلیت و برتری کے دلائل تلاش کئے جائیں اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کون سے امتیازات ہیں جن کی بنا پر آپ کا مرتبہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ سے بہتر ہے تو اس ذیل میں سب سے پہلے معرفت کی منزل میں قدم رکھنا ہوگا۔ انبیاء و مرسلین کی معرفت اور ملائکہ مقربین کے عرفان میں کوئی شک نہیں ہے۔ عرفان میں کمی ہوتی تو معصوم نہ ہوتے اور معرفت میں کوئی نقص ہوتا تو عصمت کی منزل نہ حاصل ہوتی۔ لیکن قرآن مجید اور تاریخ مذہب نے ان معصومین کے عرفان کے جو مرقع پیش کئے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آل محمدؐ کی منزل کچھ اور ہے۔ اور ان کا طرز معرفت کچھ نرالا اور انوکھا ہی ہے۔

سارے معصومین کے تذکرہ کا محل نہیں ہے۔ صرف ایک جناب ابراہیمؑ کی مثال لے لیجئے۔ جن کا مرتبہ مرسل اعظمؐ کے بعد سارے انبیاء سے افضل و برتر ہے اور جنھیں نسلی اعتبار سے بھی مرسل اعظمؐ کا مورث اعلیٰ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قرآن مجید ان کے بارے میں حکایت کر رہا ہے کہ جب ابراہیمؑ قوم کے سامنے آئے اور قوم کو گمراہی میں غرق

پایا. کوئی ستارہ پرست تھا کوئی چاند کو خدا بنائے ہوئے تھا. کوئی سورج کی پوجا کر رہا تھا تو ایک نظر میں سب کی خدائی کو باطل کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ ستارہ خدا ہے تو ڈوبتا کیوں ہے. اگر یہ چاند خدا ہے. تو غروب کیوں ہوتا ہے اور اگر یہ سورج خدا ہے تو اسے زوال کیوں ہوتا ہے. خدا کے لئے تو زوال و غروب نہیں ہے. خدا کو زوال آ گیا تو بندوں کا کیا حشر ہوگا اور خدا ڈوب گیا تو بندوں کا کیا انجام ہوگا. انھیں تو ایک چلو پانی بھی نہ ملے گا کہ اسی میں ڈوب مریں۔

انداز گفتگو بتا رہا ہے کہ ابراہیمؑ نے معرفت الہٰی میں مخلوقات کو ذریعہ معرفت بنایا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ بندوں کو معرفت خدا میں مخلوقات ہی کو ذریعہ بنانا ہوگا اور اسی طرح سوچنا ہوگا کہ جب یہ مخلوقات خدائی کرنے کے قابل نہیں ہیں تو کوئی دوسری ہستی ہے جو خدائی کی اہل ہے اور اسی کے اشاروں پر یہ کائنات چل رہی ہے لیکن امام زین العابدینؑ کا انداز معرفت اس سے جدا گانہ ہے. آپ دعائے ابوحمزہ ثمالی میں بارگاہ احدیت میں عرض کرتے ہیں بِكَ عَرَفْتُكَ وَاَنْتَ دَلَلْتَنِي عَلَيْكَ وَدَعَوْتَنِي اِلَيْكَ. پروردگار میں نے تجھ کو تیرے ہی ذریعہ پہچانا ہے اور تو نے ہی اپنی طرف مجھے دعوت دی ہے اور تو نے ہی میری راہنمائی کی ہے. تو نہ ہوتا تو تیری معرفت نہ ہوتی اور تیری رہنمائی نہ ہوتی تو کوئی تجھ تک پہونچ نہ سکتا۔ یہ انداز امام زین العابدینؑ کا نہیں ہے بلکہ محمدؐ و آل محمدؐ کا مشترک انداز ہے۔

مولائے کائنات" دعائے صباح" میں عرض کرتے ہیں: "یَا مَنْ دَلَّ عَلٰی ذَاتِهٖ بِذَاتِهٖ۔ اے وہ خدا جس نے اپنی ذات کی طرف اپنی ذات ہی سے راہنمائی کی ہے اس کی معرفت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے وہ اپنی معرفت کا خود ذریعہ ہے۔ ایسا کیوں ہے اور آل محمدؐ نے یہ نیا طریقہ کیوں نکالا ہے. انبیاء اس راہ پر کیوں نہیں چلے.

راز بہت واضح ہے۔ ایک لمحہ کے لئے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے انبیا اس راستہ کو اختیار کر لیتے تو بے معرفت رہ جاتے اور اہلبیتؑ اس راستہ کو اختیار نہ کرتے تو بے معرفت رہ جاتے۔ یعنی اہلبیتؑ کے لئے وہی راستہ ممکن تھا جو انھوں نے اختیار کیا ہے اور انبیاء و مرسلین کے لئے وہی راستہ ممکن تھا جو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ اس میں نہ اُن کا کوئی قصور ہے اور نہ ان کا کوئی قصور۔ یہ تخلیق کا ایک فلسفہ ہے جس نے ہر ایک کا انداز معرفت جُدا جُدا کر دیا ہے تفصیل میں جانا مناسب نہیں ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انبیاء کی تخلیق زمین و آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ انھوں نے پیدا ہو کر زمین کو دیکھا ہے۔ آسمان کو دیکھا ہے۔ ستاروں کو دیکھا ہے۔ چاند کو دیکھا ہے سورج کو دیکھا ہے۔ کواکب کو دیکھا ہے۔ سیارات کو دیکھا ہے اور پھر انھیں کو ذریعہ معرفت بنایا ہے اور دنیا کو آواز دی ہے کہ اگر خدا کو پہچاننا ہے تو انھیں مخلوقات کو ذریعہ بناؤ۔ میں معرفت لے کر آیا ہوں لیکن اس کائنات میں معرفت کا واحد ذریعہ یہی مخلوقات ہیں جنھیں دیکھ کر خالق کے وجود، اس کے علم و اقتدار اور اس کی حکمت و عدالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے لیکن آل محمدؐ کی منزل اس سے جدا گانہ ہے۔ ان کا نور اس وقت پیدا ہوا ہے جب زمین نہیں تھی۔ آسمان نہیں تھا۔ ستارے نہیں تھے۔ کواکب و سیارات نہیں تھے۔ ایسے موقع پر ان مخلوقات کو معرفت کا ذریعہ بنایا جاتا تو یہ نور بے معرفت ہی رہ جاتا اور نور کا بے معرفت رہنا ممکن نہیں تھا اس لئے قدرت نے اس کے لئے معرفت کا نیا راستہ نکالا اور آواز دی۔ اے نور محمدی کائنات مجھے مخلوقات کے ذریعہ پہچانے گی تجھے میں اپنی معرفت براہ راست عطا کروں گا۔ تو نہ زمین کا محتاج ہوگا نہ آسمان کا۔ نہ ستاروں کا محتاج ہوگا نہ کواکب و سیارات کا۔ تیرا انداز الگ ہوگا۔ تیری منزل الگ ہوگی اور تجھے اتنا بلند تر بنا دوں گا کہ دنیا مجھے مخلوقات کے ذریعہ پہچانے گی اور میں مخلوقات کو

اپنی معرفت تیرے ذریعہ سے عطا کروں گا۔ سب مجھے دنیا کے ذریعہ پہچانیں گے اور دنیا مجھے تیرے ذریعہ پہچانے گی تاکہ محتاج اور بے نیاز کا فرق واضح ہو جائے اور اہل دنیا سمجھ لیں کہ جو کائنات کا محتاج ہوتا ہے وہ کون ہوتا ہے اور جس کی کائنات محتاج ہوتی وہ کون ہوتا ہے۔

اور جب کائنات اپنے وجود میں تیری محتاج رہے گی تو معرفت میں تیری محتاج کیسے نہ رہے گی اور جب سب کو تیرا محتاج بنا دوں گا تو سب تیرے تابع فرمان ہوں گے چاند تیرے اشاروں پر ٹکڑے ہوگا۔ سورج تیرے اشاروں پر مغرب سے پلٹ آئیگا۔ پانی تیرے اشاروں پر جواہرات میں تبدیل ہو جائے گا سنگریزے تیرے اشارہ پر کلمہ پڑھنے لگیں گے اور ملک الموت تیرے اشارہ پر تیری زائرہ کی روح کو واپس کردیگا۔ دنیا پہچان لے کہ تجھے میں نے کچھ اور بنایا ہے اور دنیا کو اور ــــ تیری منزل کچھ اور رکھی ہے اور انبیاء کی منزل کچھ اور ــــ انبیاء میں سلیمان بھی ہونگے تو ملک الموت انھیں بیٹھنے کی اجازت نہ دیں گے اور تیرے گھرانے کا قیدی بھی ہوگا تو ملک الموت بلا اذن قدم آگے نہ بڑھائیں گے۔

جب انبیاء کا انداز معرفت دیکھ لیا اور آل محمدؐ کی انفرادیت سمجھ میں آگئی تو ملائکہ کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں معرفت کردگار تو بڑی چیز ہے۔ بلا وسیلہ اپنی معرفت بھی نہیں ہے۔ کیا دنیا اس واقعہ کو بھلا دے گی کہ بزم پیغمبرؐ میں جبرئیلؑ امین بیٹھے ہوئے ہیں۔ اچانک علیؑ آگئے۔ جبرئیلؑ تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے۔ پیغمبرؐ نے پوچھا جبرئیل تم نے تعظیم کیوں کی۔ عرض کی خدا کے رسولؐ! علیؑ کا مجھ پر حق ہے۔ جب عالم انوار میں مجھ سے سوال ہوا تھا کہ جبرئیل بتاؤ تم کون ہو اور میں کون ہوں؟ تو نور علیؑ ہی نے میری راہنمائی کی تھی ــــ اب کتنی بدنصیب ہے وہ امت جس کو

ملائکہ کا اُستاد اور عالم قدس کا راہنما مل جائے اور وہ اسے چھوڑ کر کرامت کے گنہگاروں کو راہنما بنا لے۔

صحیفہ کاملہ آپ کے انداز معرفت کا شاہکار ہے اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عبد و معبود کا رشتہ کیا ہے اور بندگی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ وہ دعائیں، وہ مناجاتیں، وہ حسن طلب، وہ حسن قبول۔ وہ صفات جلال و جمال کا تذکرہ۔ وہ ذات وصفت کی بحثیں۔ وہ معرفت کے درس۔ وہ انجام دنیا کا اعلان وہ عاقبت کی فکر۔ وہ خوف خدا۔ وہ بیان جنت۔ وہ تذکرہ جہنم۔ غرض جو کچھ صحف انبیاء میں ہے سب اسی مختصر مجموعہ میں موجود ہے اور بدرجہ اتم موجود ہے۔ جبھی تو صاحبان معرفت نے کبھی اسے زبور آل محمدؐ کہا ہے اور کبھی انجیل اہلبیتؑ اور یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر قرآن کتاب باقی نہ ہوتا اور یہ بیانات تفسیر و تشریح قرآن نہ ہوتے تو اسے مصحف کا مرتبہ حاصل ہوتا لیکن یہ عظمت قرآن ہے کہ اسے مصحف کا مرتبہ نہیں دیا گیا اور انفرادیت کے اظہار کے لئے کلام کو صحیفہ کہا گیا اور متکلم کو مصحف ناطق

معرفت کے ساتھ جب عبادت کی منزل پر نظر جاتی ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر نماز اس شان سے ادا ہوتی ہے جیسے یہی زندگی کی آخری نماز ہو اور ہر سجدہ اس شان سے ادا ہوتا ہے جیسے یہی زندگی کا آخری سجدہ ہو۔ واقعہ کربلا کے بعد بھی آپ کی زندگی صرف گریہ وزاری میں نہیں گذری اور یہ الزام بالکل غلط ہے کہ آپکے پاس رونے پیٹنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا جیسا کہ بعض نافہم افراد کہہ دیا کرتے ہیں کہ امام کا کام ہدایت امت ہے۔ گریہ وزاری نہیں ہے۔ اور امام زین العابدینؑ نے سارا وقت گریہ وزاری میں صرف کر دیا اور معاذ اللہ اپنے

فریضہ منصبی کو ادا نہیں کیا۔ آپ کا مشغلہ عبادت الٰہی بھی تھا اور تبلیغ دین بھی۔ ہدایت امت بھی تھا اور باپ پر گریہ وزاری بھی۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث آخر کلام میں ہوگی۔ فی الحال امام کے مشاغل زندگی پر گفتگو ہو رہی ہے۔ عبادت۔ درسِ معرفت۔ احترام طالب علم دین۔ فرمانبرداری۔ یتیم نوازی یہی وہ مشاغل تھے جن میں آپ کے صبح و شام بسر ہوتے تھے۔

عبادت کا یہ عالم تھا کہ زین العابدین اور سید الساجدین لقب مل گیا۔ درس معرفت کی یہ کیفیت تھی کہ کلام کا مجموعہ زبور آل محمدؐ اور انجیل اہلبیتؑ ہو گیا......
احترام طالب علم کا یہ انداز تھا کہ کوئی معمولی سا طالب علم بھی آگیا تو یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے کہ اس کا احترام وصیت پیغمبرؐ ہے اور اس کی ذات سے وصیت پیغمبر زندہ ہے۔ غربا پروری اور یتیم نوازی کا یہ عالم تھا کہ رات کا بڑا حصہ غریبوں کے گھر سامان غذا پہونچانے میں صرف ہوتا تھا اور اکثر یتیموں کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہمارا سامان لانے والا کون ہے۔ یہ تو اس دن معلوم ہوا جب یتیموں کا یہ والی، غریبوں کا یہ وارث زہر دغا سے شہید ہو کر دنیا سے گذر گیا اور بیکسوں کا آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ ایسی مصروف اور فعال زندگی پر بے کاری کا الزام جہالت نہیں تو اور کیا ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد فوراً ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو آپ کی امامت سے الگ ہو گیا تھا اور اس نے محمد حنفیہ کو امام مان لیا تھا۔ اس طبقہ کے پاس دو تصورات تھے۔ ایک تو یہ کہ محمد حنفیہ امام حسینؑ کے بھائی ہیں اور حضرت علیؑ بن الحسینؑ بیٹے ہیں اور کھلی ہوئی بات ہے کہ بھائی کے ہوتے ہوئے بیٹے کے امام ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یعنی جس طرح امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ امام ہوئے ہیں اسی طرح ان کے بعد ان کے

دوسرے بھائی محمد حنفیہ کو امام ہونا چاہیئے۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ واقعہ کربلا ایک نیا اقدام چاہتا ہے اور اتنا عظیم ظلم خاموشی سے برداشت نہیں کیا جا سکتا ضرورت ہے کہ وقت کا امام اُٹھے اور یزیدیت سے انتقام لے کر اسے فنا کر دے اور امام علیؑ بن الحسینؑ خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور صرف اپنے باپ کا ماتم کر رہے ہیں۔ لہٰذا کسی ایسے کو امام بنا لینا چاہیئے جو حالات کے تقاضے کے مطابق اُٹھے اور بنو امیہ کے تخت و تاج کو خاک میں ملا دے۔

ان دونوں تصورات کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ان میں امامت کو اہلیت کے بجائے وراثت سے مربوط کر دیا گیا ہے اور دین الٰہی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ امامت کے لئے اقدام اور انتقام کو ضروری سمجھا گیا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ امامت کے لئے اقدام و انتقام ضروری ہوتا تو وفات پیغمبرؐ کے بعد امیر المومنینؑ بھی امام نہ رہ جاتے اور آپ کا مسلسل ۲۵ سال کا سکوت محلِّ اعتراض بن جاتا۔ امام کا سکوت خود اس بات کی دلیل ہے کہ امامت کے اقدامات حالات اور مصالح کے تابع ہوتے ہیں۔ مصلحت ہوتی ہے تو اقدام کیا جاتا ہے ورنہ سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کے حالات کیا تھے اور آپ کی ذمہ داریاں کیا تھیں اس کا تجزیہ کرنے کے لئے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات ہر انسان کی نگاہ کے سامنے ہیں۔ اب یہ ذمہ داری براہ راست جناب محمد حنفیہ کی تھی کہ وہ قوم کو امامت کے مفہوم سے آشنا کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ امام میں نہیں ہوں۔ امام میرا بھتیجا ہے لیکن ان کے ساتھ بھی یہ دشواری تھی کہ وہ ایک ایسی نا اہل قوم دیکھ چکے تھے جس نے باپ کی صلح پسندی کو دیکھ کر خوارج کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور باپ ہی سے درپے جنگ ہو گئے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ حقیقت واضح ہو جائے اور لوگ

مجموعی طور پر اس گھرانہ سے بیزار بھی نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ آپ نے نہایت حسین رخ یہ اختیار کیا کہ مجمع عام میں امام زین العابدینؑ سے بحث کرنے لگے اور یہ کہا کہ امامت کا حقدار مجھے ہونا چاہیئے۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ تم میراث امامت میرے حوالے کر دو اور اس طرح امت پر حقیقت واضح کر دی۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا کہ چچا آپ تو جانتے ہیں کہ اپنے باپ کے بعد امت کا امام میں ہوں اور اگر آپ کو اس میں کچھ کلام ہے تو چلئے خانہ کعبہ میں حجر اسود سے شہادت طلب کریں وہ جس کی امامت کی گواہی دے دیگا اسے امام تسلیم کر لیا جائے گا۔ محمد حنفیہ خوش ہو گئے اور خوشی خوشی مجمع کے ساتھ حجر اسود تک آئے۔ سلام کیا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد امام زین العابدینؑ نے سلام کیا۔ حجر اسود نے جواب سلام دیا اور آواز دی کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وصی رسولؐ اور امت کے امام ہیں ــــ

فیصلہ ہو گیا۔ حقیقت بے نقاب ہو گئی۔ محمد حنفیہ مطمئن ہو گئے لیکن قوم کے نافہم افراد یہ کہنے لگے کہ محمد حنفیہ نے بھی معاذ اللہ اسی طرح دعوائے امامت کیا تھا جس طرح امیرالمومنینؑ کے دور میں اور لوگوں نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ لہذا دونوں کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک ہونا چاہیئے۔ لیکن میں کہوں گا کہ کاش دنیا نے اتنا سوچا ہوتا کہ کل کے دعویداروں میں اور محمد حنفیہ میں ایک بنیادی فرق ہے کہ وہ لوگ امامت کو قوم کا حق سمجھتے تھے اور محمد حنفیہ اسے خدائی منصب سمجھتے ہیں ــــ خدائی منصب نہ سمجھتے تو قوم سے الکشن کراتے۔ حجر اسود سے فیصلہ نہ کراتے ــــ

دوسری بات یہ ہے کہ محمد حنفیہ کو معلوم تھا کہ حجر اسود کسی کا تابع نہیں ہے۔ قوم کا امام مان لینا آسان ہے۔ حجر اسود کا گواہی دینا بہت مشکل ہے۔ اگر ان کی نیت میں ذرا بھی فساد ہوتا تو کبھی اس فیصلہ پر راضی نہ ہوتے لیکن ان کا تو منشا ہی یہی تھا کہ

قوم دیکھ لے کہ امام کیسا ہوتا ہے اور امامت کے کمالات کیا ہوتے ہیں تاکہ جہاں ایسے کمالات نظر آئیں وہاں امامت تسلیم کی جائے اور جہاں ایسے کمالات نہ ہوں وہاں خلافت وحکومت ہو تو ہو امامت نہ مانی جائے۔

محمد حنفیہ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ امامت سید الساجدین کا حق ہے میرا حق نہیں ہے۔ اب امام کی ذمہ داری ہے کہ چچا کی نیک نفسی کی جزا دیں اور دنیا پر واضح کر دیں کہ میرا چچا بد نفس اور بے عمل نہیں ہے۔ چنانچہ امامؑ نے بھی حسن نیت کی جزا دی اور بہترین جزا دی کہ جب حضرت مختار نے انتقام خون حسینؑ کی تحریک چلانے کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا یہ مسئلہ میرے چچا کے حوالے ہے۔ اب اگر محمد حنفیہ مخالف ہوتے تو اتنا بڑا مسئلہ ان کے حوالے نہ کیا جاتا اور ان کی مرضی کو مرضی امامت نہ قرار دیا جاتا ــــ یہ محمد حنفیہ کے حسن نیت کی جزا تھی کہ میرے کمال کا اظہار آپ کا فریضہ ہے اور آپ کے کمال کا اعلان میرا فرض ہے۔ اس کا ایک عظیم مذہبی فائدہ یہ ہوا کہ مختار کو تحریک انتقام کی اجازت مل گئی اور سیاسی دنیا میں امامت پر انتقام کا الزام نہیں لگایا جا سکا۔ ورنہ جس طرح کل امیر المومنینؑ کے اقدامات پر حرص ملک کا الزام لگا دیا گیا تھا اسی طرح آج بھی مختار کی تحریک کو امام زین العابدینؑ کے "حرص ملک" کا نام دے دیا جاتا۔ کیا کہنا مصلحت امامت کا کہ قاتلان حسینؑ کا خاتمہ بھی ہو گیا اور دامن امامت پر کوئی دھبہ بھی نہیں آنے پایا اور کیا کہنا مختار کی نیک نیتی کا کہ اپنے اقدام میں کھلم کھلا امام کو شریک نہیں بنایا اور آواز دی مولا! غلام ملک گیری کا الزام لے سکتا ہے لیکن آپ کے دامن پر کوئی الزام نہیں آنے دے گا۔

دنیا امام زین العابدینؑ کی شخصیت کو پامال کرنے پر کس طرح تلی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب حضرت حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور ادھر سے

ہشام بن عبد الملک بھی آگیا۔ ہشام کو حجر اسود تک جانے کا راستہ نہ ملا اور جب حضرت بڑھے تو مجمع خود بخود ہٹ گیا۔ کسی نے ہشام سے پوچھا یہ کون ہیں جن کے لئے قدرتی طور پر یہ اہتمام ہوا ہے۔ ہشام نے کہا کہ میں نہیں پہچانتا ۔۔۔! یہ سننا تھا کہ فرزدق شاعر کو جوش آگیا۔ کہنے لگا کہ امیر تو اسے نہ پہچانے گا " یہ وہ ہے جس کے قدموں کی چاپ کو سرزمین بطحا پہچانتی ہے۔ اسے حل و حرم پہچانتے ہیں۔ اسے خانہ کعبہ پہچانتا ہے۔ یہ رسول اعظمؐ کا وارث ہے۔ بہترین بندگان خدا متقی و پرہیزگار اور قریش میں انتہائے کرم کی منزل پر فائز ہے۔ یہ کعبہ کی طرف بڑھتا ہے تو کعبہ خود اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے۔ یہ ابن فاطمہؑ ہے۔ یہ فرزند رسولؐ ہے۔ اس کا عالم یہ ہے کہ جب کوئی سامنے آجاتا ہے تو یہ کمال غیرت سے سر نہیں اٹھاتا اور وہ بھی کمال ہیبت سے سر جھکائے رہتا ہے ۔۔۔

فرزدق کا کیا انجام ہوا یہ آپ کو معلوم ہے۔ حکومتوں کے پاس سزا دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ لیکن فرزدق نے مدح کا حق ادا کر دیا اور بتا دیا کہ انھیں نہ پہچاننا اپنے کفر کی علامت ہے۔ ان کی شخصیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔

حالات کی یہی نزاکت تھی جس نے بظاہر امامؑ کا مشغلہ گریہ و زاری کو بنا دیا تھا اور آپ آنسوؤں کی چھاؤں میں تبلیغ دین کر رہے تھے۔ منشا یہ تھا کہ گریہ و بکا کے ذریعہ ذہنوں کو ہموار کیا جائے۔ طبیعتوں کو پگھلایا جائے اور جب غم کی آنچ پر لوہا نرم ہو جائے تو صحیفہ کاملہ کی چوٹ لگائی جائے۔ گریہ مقصد زندگی نہیں تھا بلکہ تمہید تبلیغ تھا۔ جس طرح مرسل اعظمؐ نے چالیس سالہ سکوت سے قوم کے ذہن کو ہموار کیا تھا اور اس کے بعد اپنے نظام کو پیش کیا تھا۔ اسی طرح امام زین العابدینؑ نے گریہ و زاری۔

مجلس و ماتم سے ذہنوں کو ہموار کیا اور پھر معرفت کے سبق سکھائے۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب قید شام سے رہائی ہوئی اور ثانی زہراؑ نے کہا بیٹا۔ یزید سے کہہ دو کہ ہمارے لئے ایک مکان خالی کرا دے تاکہ ہم اپنے وارثوں کا ماتم کر سکیں۔ ثانی زہراؑ کربلا یا مدینہ جا کر بھی ماتم کر سکتی تھیں۔ لیکن چاہتی تھیں کہ صف ماتم شام میں بچھے تاکہ یہاں کے لوگ اور یہاں کی عورتیں پرسہ دینے کے لئے آئیں اور ہم ان سے اپنے واقعات بیان کریں اور یوں آنسو تیشۂ غم بن جائیں۔ امام زین العابدینؑ کی زندگی کا انداز بھی یہی تھا کہ پہلے مجلس غم برپا کرتے تھے اور جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو اپنے مصائب کے ذیل اسلام کے حقائق نشر کر دیا کرتے تھے۔ تاریخ کائنات میں اس سے زیادہ حسین طریقۂ تبلیغ دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ یہ امامت کا کمال تھا کہ ہجوم مصائب میں تبلیغ کا انوکھا راستہ نکال لیا اور ایسا راستہ نکالا کہ دشمن کو بھی اس کی تاثیر کا کلمہ پڑھنا پڑا اور آج جو لوگ بیان فضائل کو حرام نہیں کہتے وہ بھی بیان مصائب اور ذکر مقتل کو حرام کہتے ہیں یہ آنسوؤں کے خلاف فتوے۔ یہ گریہ و بکا کے خلاف آوازیں۔ یہ بدعت و حرام کے نعرے دلیل ہیں کہ دوست غم کی تاثیر کو پہچانیں یا نہ پہچانیں دشمن ضرور پہچانتا ہے اور اس سلسلہ کو روکنا چاہتا ہے لیکن وہ سیلاب کیا رکے گا جس میں عابد بیمار کے ۳۵ سال کے آنسو شامل ہوں۔ جس میں زینب کبریٰ کا گریہ شامل ہو۔ جس میں فاطمہ زہراؑ کی فریاد شامل ہو۔ جس میں آل محمدؐ کی صف عزا شامل ہو۔ جس میں اولاد رسولؐ کا درد شامل ہو۔ حکومتیں مٹ گئیں غم حسینؑ نہ مٹ سکا۔ سلطنتیں فنا ہو گئیں۔ ذوق عزا فنا نہ ہو سکا۔ یہ فاطمہ زہراؑ کی تمنا ہے۔ یہ پیغمبر اکرمؐ کا وعدہ ہے۔ یہ قدرت کا انتظام ہے۔ یہ زینبؑ کبریٰ کی بنیاد ہے۔ یہ عابدؑ بیمار کا جہاد ہے —— وہ شام کا بازار۔ وہ دربار۔ وہ قید خانہ —— وہ ہجوم مصائب اور وہ بیمار امامؑ کا درد و غم۔

کون اندازہ کر سکتا ہے کہ زندگی کن مصائب سے گذری ہے اور بیمار امامؑ نے کس طرح سے صبر کیا ہے۔ دنیا سے تو آلِ محمدؐ کا رونا بھی برداشت نہ ہو سکا۔ کربلا سے شام تک تازیانوں پر تازیانے مارے گئے کہ کوئی عزیزوں کے غم میں رو نہ سکے۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ سکینہؑ باپ کے لاشہ سے لپٹی ہوئی ہے اور شمر تازیانے لگا رہا ہے۔ عابدِ بیمار کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور اشقیا نوکِ نیزہ چبھو رہے ہیں۔ شہزادیاں رونا چاہتی ہیں اور سامنے وارثوں کے سر لاکر رکھ دیئے جاتے ہیں اور تماشائیوں کا مجمع لگا دیا جاتا ہے۔ جس پر یہ مصائب گذرے ہوں انھیں کا دل جانتا ہے کہ ایک دوپہر میں لاشوں پر لاشیں۔ جنازوں پر جنازے آئیں۔ عصر ہوتے ہوتے باپ کا سر نوکِ نیزہ پر۔ تھوڑی دیر میں باپ کے لاشہ پر ادھر کے سوار اُدھر۔ اُدھر کے سوار ادھر۔ چند لمحے گذرے تھے کہ خیموں میں آگ، بھڑکتے شعلے، لٹتی چادریں، تازیانے، طمانچے — الامحرم کو بے گور و کفن لاشوں کو چھوڑ کر اس شان کی روانگی کہ ماں بہنیں کھلے سر۔ اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ پیروں میں بیڑیاں۔ گلے میں طوقِ خاردار۔ پھر کوفہ کا بازار۔ ابنِ زیاد کا دربار۔ شام کی منزلیں۔ منادی کی آواز تماشائیو! تماشا دیکھو یہ اہلبیتِ رسولؐ ہیں جنھیں قیدی بنا کر لیجایا جا رہا ہے — جس کی نظر میں ایسے مصائب ہوں اس کا گریہ کیا تھم سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب خادم نے عرض کی کہ مولا کب تک روئیے گا۔ فرمایا۔ بھائی تونے انصاف نہیں کیا۔ یعقوبؑ سے ایک یوسفؑ جدا ہو گیا تھا۔ اتنا روئے کہ آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ میرے تو اٹھارہ یوسف ایک دوپہر میں ذبح کر دیئے گئے — عرض کی مولا! یعقوب کے لئے یہ نیا حادثہ تھا لیکن آپ کے لئے تو شہادت میراث ہے۔ فرمایا۔ بھائی شہادت میراث ہے لیکن کیا یہ بھی میراث ہے کہ ماں بہنوں کے کھلے ہوئے سر ہوں۔ تماشائیوں کا مجمع ہو۔ نوکِ نیزہ پر سرہائے شہداء ہوں اور میں قافلہ کو لے کر دیار بہ دیار

اور شہر بہ شہر جاؤں۔

امامؑ کا یہ عالم ہے کہ دن ہے تو رونا۔ رات ہے تو رونا۔ کھانا دیکھا تو رونا۔ پانی آیا تو رونا — کیسے کھاؤں میرا بابا بھوکا ذبح ہو گیا۔ کیسے پانی پیوں میرا باپ پیاسا مارا گیا۔ وضو کا پانی سامنے آیا تو اتنا روئے کہ پانی دو چند ہو گیا اور پھینک دیا۔ دنیا سے یہ گریہ بھی برداشت نہ ہو سکا اور ظالم ولید بن عبد الملک نے ۲۵ محرم ۹۵ھ کو زہر دے کر امامؑ کو شہید کرا دیا۔ زہر کا اثر شروع ہوا تو امام محمد باقرؑ کو بلا کر فرمایا۔ بیٹا اب میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میری تجہیز و تکفین کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے۔ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ زہر کا اثر بڑھا۔ امامؑ خاموش ہوئے۔ ملک الموت نے روح قبض کی اور امامؑ نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ مدینہ میں خبر شہادت پھیلی۔ چاروں طرف کہرام۔ پرسہ دینے والوں کا ہجوم۔ رونے والوں کا مجمع۔ نماز جنازہ ادا کرنے والوں کا اژدھام۔ آج مدینہ کا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ آج مسلمانوں کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ گریہ بیمار کا اثر۔ یہ اہلبیتؑ میں پہلا جنازہ ہے جو اہتمام سے اٹھ رہا ہے۔ جنازۂ پیغمبرؐ میں چند افراد۔ جنازہ زہراؑ رات کی تاریکی میں۔ جنازہ امیرؑ خاموشی کے ساتھ۔ جنازہ حسن مجتبیٰؑ پر تیروں کی بارش اور جنازہ حسینؑ کربلا کی خاک پر کہ ادھر کے سوار آدھر اور آدھر کے سوار ادھر — یہ پہلا موقع تھا کہ جب امام محمد باقرؑ نے غسل و کفن دے کر جنازہ رکھا ہے تو نماز پڑھنے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ آسمان سے ملائکہ کی تکبیر کی آوازیں بلند تھیں۔ ہر طرف شور گریہ و بکا تھا — مگر عزادارو! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ منظر دیکھ کر روح سید سجادؑ شاد ہو گی اور اپنے جنازہ کا یہ عالم دیکھ کر روح امام مطمئن ہو گی۔ نہیں ہرگز نہیں! میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ جب جنازہ کاندھوں پر بلند

ہوا ہوگا اور ہزاروں کے مجمع میں بقیع کی طرف چلا ہوگا تو بیمار امامؑ نے تابوت سے کربلا کا رُخ کر کے آواز دی ہوگی۔ بابا! یہ آپ کا لال شرمندہ ہے کہ آج میرے جنازہ میں یہ مجمع۔ میرا تابوت اُٹھانے والے اتنے ـــ مگر کل جب میں کربلا سے رخصت ہو رہا تھا تو آپ کا جنازہ خاکِ گرم پر پڑا ہوا تھا۔ ریگِ صحرا کا کفن ـــ بابا آپ کا جنازہ دفن بھی ہوا تو ایک اکیلا بیمار فرزند۔ نہ اعزا نہ اقربا۔ نہ چاہنے والے۔ نہ دل کے ٹکڑے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب میں نے آپ کے جسمِ اقدس کو قبر میں اُتارا تھا تو دو ہاتھ برآمد ہوئے تھے اور آواز آئی تھی۔ لاؤ بیٹا زین العابدینؑ ـــ لاؤ میری امانت کو میرے حوالے کر دو۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنْ

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

ختم شد

محافل و مجالس

حصّہ دوئم

تصنیف

علامہ سیّد ذیشان حیدر جوادی

امام محمد باقرؑ سے امام زمانہؑ تک آٹھ معصومین کی

داستان عظمت و عزیمت

مذہبی دنیا سے طلب کریں

علامہ سید ذیشان حیدر صاحب قبلہ جوادی

کے

بیش بہا علمی کارنامے

انوار القرآن
مطالعۂ قرآن
اصول و فروع
نقوش عصمت
قمر بنی ہاشم
ابو طالب مومن قریش
نص و اجتہاد
فدک تاریخ کی روشنی میں
مجھے راستہ مل گیا
کربلا
اسلامی بینک

پردہ
خاندان و انسان
عقیدہ و جہاد
اسلام دین عقیدہ و عمل
محافل و مجالس ۲ جلد
بضعۃ الرسول
عرفان رسالت
کربلا شناسی
رسالت الٰہیہ
کلام کلیم
سلام کلیم

ملنے کا پتہ

جامعہ امامیہ انوار العلوم مرزا غالب روڈ الٰہ آباد
تنظیم المکاتب جگت نرائن روڈ لکھنؤ